ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

جنوری ۲۰۱۷ء

ایک عزم کیجئے

"یا أیها الرسول بلغ ما انزل إلیك من ربك" کے واجب کی ادائیگی کے لیے، عالمی نبی کے عالمی پیغام کو تمام عالم انسانیت تک پہنچانے کے لیے اس ربیع الاول میں ایک عزم کیجئے کہ نبیؐ کی سیرت اور آپ کی پرکشش تعلیمات کو آئندہ ربیع الاول تک اس ملک کے ہر عام وخاص تک پہنچانا ہے، یہ ایک بڑا کام ہے اور انقلابی کام ہے، بالخصوص ارباب مدارس عزم کریں کہ سیرت رسول کو چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں، سیرت کی انسانیت نوازی، سیرت کا اخلاقی پہلو پمفلٹ کی شکل میں پورے ملک میں عام کرنا ہے، ہر علاقائی اور ہندستانی زبان میں یہ کتابچے تیار کرنا ہے اور لوگوں تک پہنچانا ہے، یہ کام کرنے کا ہے، اس سے نہ صرف سوچ بدلے گی بلکہ حالات بدلیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے ذمہ جو واجبات ہیں ان کی ادائیگی کے لیے یہ ہمارا ایک اہم اور مؤثر اقدام ہوگا۔ (مدیر)

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	تبلیغ کے اصول	علامہ سید سلیمان ندویؒ	
۲۔	اداریہ	ایک مجرم کی طرح اہل وفا بیٹھے ہیں	مدیر	۳
۳۔	خاص تحریر	اسلام کا مقصد جنگ اور حلب میں.....	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۹
۴۔	پیام سیرت	محمد ﷺ کا ایک دیوانہ غلام	محمد فرید حبیب ندوی	۱۳
۵۔	اسلامی تعلیمات	مشترکہ خاندانی نظام کے بعض مشکلات.....	محمد قمر الزماں ندوی	۱۶
۶۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۱۰)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۲۷
۷۔	اصلاح معاشرہ	اشیاء میں ملاوٹ، ایک بڑا جرم اور اخلاقی.....	مفتی رحمت اللہ ندوی	۳۰
۸۔	صحافت	آزادی کے بعد اردو صحافت	مولانا محمد علاء الدین ندوی	۳۳
۹۔	// //	کتاب اور اردو صحافت	محمد عارف اقبال	۳۸
۱۰۔	نقد و نظر	راشد شاز اور عمل صالح	محمد غزالی ندوی	۴۰
۱۱۔	تعلیم و تربیت	کثیر لسانی فارمولہ	ابوفہد	۴۶
۱۲۔	// //	طلبہ میں مقصدیت کا فقدان؟ ذمہ دار کون؟	خالد ضیاء صدیقی ندوی	۵۰
۱۳۔	عالم اسلام	فتح اللہ گولن اور پاک ترک انٹرنیشنل.....	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۵۳
۱۴۔	// //	مسلمانان برما وحشیانہ ضربوں کے سایہ میں	کفیل احمد ندوی	۵۶
۱۵۔	زبان و تہذیب	الفاظ کا جادو	مولانا عبدالماجد دریابادیؒ	۵۹
۱۶۔	آخری صفحہ	''میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا''	م۔ق۔ن۔	۶۳
۱۷۔	شعر و ادب	نظم (شام کی موجودہ صورتحال کے حوالے سے)	علامہ شبلی نعمانیؒ	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

ایک مجرم کی طرح اہل وفا بیٹھے ہیں

۱۸۵۷ء میں وطن عزیز پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہوا، مسلمان یہاں کے دیگر باشندوں سے زیادہ احساس شکست وریخت کا شکار ہوئے، پھر کوئی سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا اور کوئی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی فکر میں لگ گیا، تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ ملت کے سرمایہ کو بچانے اور محرومی اقتدار کے بعد دوبارہ اسے سہارا دینے والی تحریکیں بھی چلتی رہیں، اپنے باقی ماندہ سرمایہ کی حفاظت کے لیے دارالعلوم دیوبند کا قیام ہوا، ملت کی ضروریات پوری کرنے اور اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے علی گڑھ تحریک وجود میں آئی، ان دونوں مخلصانہ جذبات سے وجود میں آئی تحریکوں کے درمیان بڑھتی خلیج کو پاٹنے کے لئے ندوۃ العلماء کی تحریک اور پھر اس کا دارالعلوم معرض جود میں آیا، سب نے اپنے اپنے حصہ کا کام کیا، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ آج بھی مسلمانوں کو قدیم وجدید کی جنگ کا سامنا ہے، قدیم وجدید کی وہ خلیج آج بھی باقی ہے جس کو پاٹنے کے لیے خود حضرت شیخ الہندؒ نے ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے موقع پر صدارتی خطبہ دیا تھا اور کالج کے طلبہ سے وہ امیدیں وابستہ کی تھیں جو اس وقت تک بر نہ آئی تھیں،، کیا آج بھی مسلمانوں کو سیاسی، تہذیبی اور تاریخی وثقافتی محاذوں پر زبردست چیلنجز کا سامنا نہیں ہے، کیا آج بھی مسلمان سیاسی بے بسی کے ساتھ دور اندیش، ملی شعور سے سرشار، دین ودنیا کے رمز شناس، زمانے کی بدلتی رُتوں کے نباض افراد کار سے محروم نہیں ہیں، کیا آج بھی ملت اسلامیہ دین ودنیا اور سیاست ومذہب کی تفریقِ بے جا کے درمیان پس نہیں رہی ہے، کیا آج بھی منظر نامہ یہی نہیں کہ جنہیں دینی شعور حاصل ہے وہ حاشیہ پر ہیں، قومی انتظام اور ملکی نظام میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں، اور جو عصری آگہی رکھتے ہیں وہ مذہب بیزار اور ملی شعور سے ناآشنا ہونے کے سبب ملت کے لیے عضو معطل ہیں، آج مدارس وجامعات میں بے شمار مسلم مورخین ودانشوران کے ہوتے ہوئے بھی بھارت میں مسلمانوں کے شاندار ماضی اور سیاسی وتمدنی تاریخ کو مسخ کر دیا گیا، دنیا سمجھتی ہے کہ مسلم حکمرانوں نے سوائے دادعیش دینے اور مقبرے تعمیر کرانے کے کچھ نہ کیا، آزادی کے بعد مسلمانوں کی سیاسی بدحالی وپسماندگی نے اس احساس کو مزید فروغ دیا بلکہ پختہ تر کر دیا، آج تک ہم اپنے دامن پر لگے داغوں کو دھو نہ سکے، اورنگ زیب کی زاہدانہ وعادلانہ حکومت کو بطور آئیڈیل پیش نہ کر سکے، محمود غزنوی کے اوصاف سے برادران وطن کو روشناس نہ کرا سکے، مسلم حکمرانوں کے علمی وتمدنی کارناموں سے متعارف نہ کرا سکے، علم میں تفریق اور پھر علم تاریخ سے ہماری عدم دلچسپی اور سیاسی میدان میں ہماری بے بسی اور ہمارا دوہرا معیار وکردار ہمیں یہاں تک لے آیا کہ ٹیپو سلطان شہید جیسے عالم وفاضل وموجد وسپہ سالار حکمراں کو مجاہد آزادی نہ ثابت کر سکے، آج اس ملک میں مسلمانوں کی جو تصویر ہے زمین پر رہنے والے،

روزانہ کے اخبارات پڑھنے والے بخوبی اس سے واقف ہیں، مسلمانوں کو ان پڑھ، گنوار، ظالم و جابر، غیر مہذب و غیر متمدن سمجھا جاتا ہے، ان کے بارے میں عام تصور ہے کہ وہ باہر سے آئے ہیں، اور باہر سے آنا، ملکوں کو فتح کرنا اور قوموں کو مغلوب کرنا تو کوئی معیوب بات نہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی تصور عام ہے کہ مسلمانوں نے صرف اس ملک کو لوٹا ہے، خونریزی کی ہے اور صرف اس ملک سے لیا ہے اس ملک کو دیا کچھ نہیں، حد تو یہ ہے کہ متعدد لوگ اس احساس کا اظہار کر چکے کہ گویا اپنے ہی گھر میں وہ خود کو اجنبی سمجھتے ہیں، صورت حال بایں جا رسید کہ معمار وطن کو کرایے کے مزدور کی حیثیت سے بھی نہیں تسلیم کیا جاتا، ماضی کے حکمرانوں کو حال میں حاشیہ بردار بھی رکھنا گوارا نہیں، اپنے خون سے وطن کو سیراب کرنے والے اپنے ہی گھر میں مجرم بنا دیے گئے ہیں۔

دیکھ لے جانِ وفا آج تیری محفل میں
ایک مجرم کی طرح اہل وفا بیٹھے ہیں

ہماری پہلی بنیادی غلطی ہمارا غلط تصور تعلیم اور نظام تعلیم ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجود وسائل کی بہتات اور اسکول و کالج اور مدارس کی بڑھتی تعداد کے ہر شخص رجال کار کی عدم دستیابی کا شاکی ہے، کاش ہم نے ہوش کے ناخن لیے ہوتے اور قدیم و جدید کی تقسیم کو مٹا کر آگے بڑھے ہوتے، قدیم و جدید کی اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت شیخ الہند نے اسکول و کالج کے طلبہ سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ دم توڑ گئیں، وہ ملت کے کام کے نہ بن سکے، ان کالجوں کی تعلیم کا مقصد اول ہی ''پیٹ کے بندے'' پیدا کرنا اور ملی شعور سے بیزار کرنا ہے، آج ہماری ملت کے نوجوان دو وقت کی روٹی کا انتظام کر کے اسی قدر خوش ہوتے ہیں جس قدر خوشی دوسروں کو سب سے بڑے منصب پر پہنچنے سے ہوتی ہے، اس روٹی کے لئے ہر قربانی دینے کو تیار اور ہر کس و ناکس کی غلامی قبول کرنے پر آمادہ، یہ لوگ سسٹم کا حصہ بنتے ہیں تو سیلاب زمانہ میں تنکوں کی طرح بہہ جاتے ہیں، نہ اپنا وجود ہوتا ہے اور نہ ملی تشخص کی فکر___ اور کیوں ہو کہ ان کو تعلیم ہی یک رخی دی گئی ہے، انہوں نے جو تاریخ پڑھی ہے اس میں مسلم حکمرانوں کی جنگی کارروائیاں، ظلم و جبر سے عبارت پالیسیاں، علم بیزاری، معاشقوں اور عیاشیوں کی داستانیں انہیں پڑھائی گئی ہیں، ان کو جس نصاب و نظام میں تیار کیا گیا ہے مذہب بیزاری اس کا عنصر اساسی ہے، ظاہر ہے کہ جب کوئی مذہب بیزار ہوتا ہے تو سیکولرزم، لبرلزم، نیشنلزم یا کوئی نہ کوئی ازم اس کے لیے معراج کمال ہوتا ہے، اور اگر وہ اپنی تہذیب، اپنی ثقافت اور اپنے ماضی کی صحیح تاریخ سے بھی واقف نہیں ہوتا تو پھر اس کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ''کریلا نیم چڑھا'' پھر وہ احساس کہتری کا شکار ہوتا ہے، اپنے آپ کو اپنی ملت سے منسوب کرنے میں بھی ہچکچاتا ہے، دوسروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے اور ان کے نعروں کو بلند کرنے میں اپنی ترقی سمجھتا ہے، مستشرقین نے یہ کام بخوبی انجام دیا، یہود و نصاریٰ کا یہی ہدف رہا، آج ہماری ہر یونیورسٹی اور ہمارے اپنے قائم کردہ اداروں میں استشراق کے علمبردار موجود ہیں، قرآن و حدیث کو ان کے مصادر سے سمجھا جاتا ہے، شریعت کی ترجمانی کے لیے ان کی تشریحات کا سہارا لیا جاتا ہے، علم تاریخ کے موسس مسلم مورخین کو ہدف تنقید بناتے ہوئے مستشرقین سے تاریخ نگاری کے گُر سیکھے جاتے ہیں، نتیجہ میں پھر ہر فرد محمد عربی کے اسلام کو چھوڑ کر سیکولر اسلام کی تشکیل میں مگن نظر آتا ہے، شعائر

اسلام کی پابندی دقیانوسی معلوم ہوتی ہے اور ملت اسلامیہ کو مقتدیٰ بننے کے بجائے مقتدی بننے کے مشورے دیے جاتے ہیں۔

جہاں تک دوسرے طبقہ کا سوال ہے تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اس طبقہ نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، ملت میں دینی روح جو دوڑتی ہے تو اسی طبقہ کے دم سے، خون میں کچھ گرمی، آنکھوں میں کچھ چمک اور زندگی کی کچھ رمق اگر باقی ہے تو اسی طبقہ کی کوششوں سے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس طبقہ میں بھی علم وتحقیق کا معیار گرتا چلا گیا، تحلیل وتجزیے کی عادت نہیں رہی، عام طور سے لوگ تاریخ سے ناواقف ہوتے گئے، بیسویں صدی کے شروع میں علامہ شبلی کو جو شکوہ تھا وہ ہنوز باقی ہے، باوجود اس کے کہ خود دارالمصنفین اور بعض دیگر اداروں نے یہ کام کیا مگر جس حد تک اور جس طرح ہونا چاہیے تھا، نہ ہوسکا، نہ غیروں تک یہ بات پہنچ سکی کہ مسلمان بھارت میں آئے تو انہوں نے بھارت کو کیا دیا اور نہ اپنے ہی مسلمانوں کے علمی وتمدنی اور ترقیاتی کارناموں سے واقف ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طبقہ کا موقف بھی دفاعی ہوتا گیا، حقیقت یہی ہے کہ جب علم کی گرفت کمزور ہوتی ہے، تو اختلافات، شخصیت پرستی، انانیت اور دفاعی پالیسی قوم کی کمر توڑ دیتی ہے، نتیجہ دیکھ لیا جائے کہ آزادی کے بعد سے اب تک مسلمان صرف اور صرف صفائی دینے اور دفاع کرنے میں مصروف ہیں، اول الذکر طبقہ تو اپنی روزی روٹی کی فکر لے کر اغیار ہی کے زیر سایہ کسی طرح اپنی زندگی گزار لینے پر قانع ہے، لیکن ثانی الذکر جس میں مذہبی تعلیم کے اثر سے کہیں نہ کہیں جذبۂ قیادت انگڑائی لیتا ہے مگر وہ جلد ہی ''مصلحتوں'' اور دفاعی پالیسیوں کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے یا زیادہ سے زیادہ کچھ دل کو بہلانے والے جلسوں اور مظاہروں تک پہنچ کر دم توڑ دیتا ہے، اس جذبہ کو خارجی مسائل سے زیادہ داخلی دباؤ کے باعث اپنے جذبات کو دفن کرنا پڑتا ہے، ڈاکٹر محمد اکرم ندوی جو معروف ومشہور محقق اور معتدل مزاج فاضل ودانشور ہیں، جنہوں نے مشرق ومغرب کے میخانوں سے سیری حاصل کی ہے، بلکہ یوں کہیے مشرق سے سیر ہوکر مغرب کو سیراب کیا ہے، اپنے ایک مضمون میں بہت تلخ مگر حقیقت پسندانہ تبصرہ کرتے ہیں: ''اس وقت مسلمانوں کی علمی زندگی میں صرف دو طبقوں کی بہتات ہے، ایک گھٹیا درجہ کے صحافیوں کی، دوسرے قرآن وسنت سے ناواقف، فقہ سے نابلد، حالات سے بے خبر اور تنگ نظر مفتیوں کی، ہر مدرسہ اور ادارہ کو ایک پرچہ نکالنے اور دارالافتاء قائم کرنے کی فکر زیادہ ہوتی ہے، اس لیے نہیں کہ ان سے مسلمانوں کی کوئی علمی یا دینی ضرورت پوری ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ ان کی حیثیت عوامی رابطہ Public Relation کی ہے، علمی وتحقیقی کاموں کا احساس ہی ختم ہوتا جارہا ہے، اسی تغافل واہمال کا شکار ہے تاریخ کا علم جو ایک زمانہ میں مسلمانوں کا مفخرہ تھا۔''

صورت حال بڑی نازک ہے، وقت کم ہے اور کام بہت زیادہ ہے، کام کرنے کی اگر بات کی جاتی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ محنت وجانفشانی کے لیے کوئی تیار نہیں، میدانی محنت، جسمانی مشقت اور درجۂ صفر سے از سر نو تشکیل وتنظیم کی ذمہ داری اٹھانے سے سب جان چراتے ہیں، کھوکھلے دعوے اور بے معنی مظاہر میں تو کچھ نہ کچھ توانائی صرف کر لی جاتی ہے لیکن ایسی آگ جلانے کی ہمت کسی میں نہیں پائی جاتی جو انداز گلستاں پیدا کر سکے، علم وتحقیق کے گرتے معیار کے باعث یا تو مصلحت پرستی کا جن پیچھا نہیں چھوڑتا یا پھر گروہی اور جماعتی رجحانات ونظریات کوئی واضح پالیسی اختیار نہیں کرنے دیتے، جنت میں سب جانا چاہتے ہیں لیکن

راستے کی صعوبتیں برداشت کرنے کو کوئی تیار نہیں حالانکہ زبان نبوت نے واضح الفاظ میں متنبہ کر دیا ہے حفت الجنة بالمكاره ،سب چاہتے ہیں کہ دنیا سنور جائے ،اقتدار ہاتھ آجائے ،عظمت رفتہ بحال ہو جائے ،کوئی کوئی تو اسلام کے غلبہ کا خواب بھی دیکھ لیتا ہے لیکن ذرا غور کیجئے کہ جنت کے راستے پر چلنے کے لیے اور حصول جنت کے لیے کن کن آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا، کیسی کیسی دشواریوں کو جھیلنا پڑے گا، جو چیز جتنی قیمتی ہوتی ہے اس کے لیے قربانیاں بھی اسی قدر دینی پڑتی ہیں، محض مظاہرے، جلسے اور دوسروں کے سہارے سے کی گئی تقریریں اور جذباتی نعرے نہ دن بدل سکتے ہیں نہ حالت سنوار سکتے ہیں، اگر حصول جنت مقصود ہے تو جفاکشی اور امانتدارانہ کوشش شرط اول ہے، اگر دعوی عشق ہے تو بادیہ پیمائی، آبلہ پائی اور کوہ کنی کے بغیر معشوق تک پہنچنا ممکن نہیں، سچ کہا ہے امام شافعیؒ نے ۔

وكيف الوصول إلى سعاد ودونها
قلل الجبال ودونهن حتوف

(سعاد تک رسائی کیوں کر ممکن ہے جبکہ درمیان میں پہاڑوں کی چوٹیاں حائل ہیں اور ان چوٹیوں کو پار کرنا موت کو گلے لگانے کے مترادف ہے)۔

جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ۔

خبر نہیں، کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں، بنا کے تقدیر کا بہانہ

آج قربانیاں دینے کو کوئی تیار نہیں ،عمل پیہم سے امت مرحومہ میں روح پھونکنے کے لیے کسی میں طاقت نہیں، ذرا انقلابی کام کے لئے آواز دے کر تو دیکھیے گوشۂ عافیت اور تسبیح ومناجات کے عادی بھی میدان عمل کے سپاہی بننے کو تیار نہیں، آلام ومصائب سے وہ بھی کانپ جاتے ہیں جن کی پیشانیاں مسجدوں کے نور سے منور ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ نہ کوئی واضح پالیسی ہے اور نہ مستقبل کے تابناک ہونے کی امید، اگر علم کی یہ تقسیم ختم کر دی گئی ہوتی اور پھر ماضی کی تاریخ کا صحیح علم اور مستقبل کی تعمیر میں پیش آنے والی دشواریوں پر یقین ہوتا تو پھر قرآنی حکمت کی رہنمائی میں ملت مستقبل کی طرف گامزن ہوتی، ذرا قرآن کے اس انداز بیان پر غور کیجئے، أم حسبتم أن تدخلوا الجنة ولما يأتكم مثل الذين خلوا من قبلكم مستهم البأساء والضراء وزلزلوا حتى يقول الرسول والذين آمنوا معه متى نصر الله ألا إن نصر الله قريب (بقرہ:۲۱۴) (ترجمہ: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم جنت میں ایسے ہی داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تمہیں وہ حالات نہیں پیش آئے جو گذشتہ قوموں کو پیش آئے تھے، انہیں جسمانی اور مالی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور سخت مالی اور جانی مصائب سے دوچار ہونا پڑا، یہاں تک کہ وہ ہلا کر رکھ دیے گئے اور رسول اور ان کے ساتھ ایمان والے پکارنے لگے: کب اللہ کی مدد آئے گی (پھر اللہ کی طرف سے فرمایا گیا کہ) سن لو، کہ نصرت الٰہی قریب ہے) أم حسبتم أن تدخلوا الجنة ولما يعلم الله الذين جاهدوا

منکم ویعلم الصابرین (ال عمران:۱۴۲)(ترجمہ: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جنت میں تمہارا داخلہ اس سے قبل ہو جائے گا کہ اللہ دیکھ لے کہ تم میں مجاہدین کون ہیں اور کون صبر کرنے والے ہیں (یعنی حالات کا استقامت کے ساتھ مقابلہ کرنے والے) اور حتی اذا استیأس الرسل وظنوا أنهم قد كذبوا جاء هم نصرنا فنجی من نشاء ولا يرد بأسنا عن القوم المجرمين (یوسف:۱۱۰)(ترجمہ: یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہو جاتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ان سے غلط بیانی کی گئی تو ہماری مدد ان کو حاصل ہوتی ہے اور جسے ہم چاہتے ہیں اسے نجات ملتی ہے اور ہمارا عذاب مجرموں سے ٹالا نہیں جا سکتا) اور الٓمٓ ،أحسب الناس أن يتركوا ان يقولوا آمنا وهم لا يفتنون (عنکبوت:۱-۲)(ترجمہ: الف لام میم، کیا یہ سمجھتے ہیں کہ کہہ دیں گے کہ ہم ایمان لائے تو ان کو چھوڑ دیا جائے گا اور ان کو آزمائش کی بھٹی میں نہیں تپایا جائے گا۔)

قرآن کے اس انداز بیان سے خوب اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اگر ہم خیر کے طالب ہیں تو شر کا مقابلہ کرنا پڑے گا، اگر فتنوں سے محفوظ ہونا چاہتے ہیں تو آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا، اگر قوت کی طلب ہے تو اسباب قوت مہیا کرنے ہوں گے، اگر افراد کار درکار ہیں تو تربیت گاہیں کھولنی ہوں گی، اگر پھولوں کا چمن آباد کرنا چاہتے ہیں تو کانٹوں کی چبھن برداشت کرنی ہوگی، اگر خوشیوں کی طلب ہے تو غموں کی بھٹی میں تپنا پڑے گا، اگر مستقبل کی کامیابی کا شوق ہے تو سخت امتحان سے گزرنا پڑے گا، اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس ملک میں سب سے پہلے اپنے تعلیمی نظام کا جائزہ لیں اور خدا کے واسطے اس ضد اور ہٹ کو چھوڑ کر ملت کے حال پر ترس کھائیں جس ضد نے بڑا نقصان پہنچایا ہے، دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ ہم اس ملک میں اپنے ماضی کی تصویر واضح کریں اور مستقبل کے لیے واضح سیاسی پالیسی اختیار کریں، مسلمانوں کی موجودہ بدنما اور بدحال وخوفناک تصویر کو بدلنے کے لیے دو کام بہت ضروری ہیں، ایک کا تعلق علم وتحقیق سے ہے اور دوسرے کا تعلق میدان سیاست سے، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تاریخ کو عام کریں، اس ملک میں مسلمانوں کے تہذیبی، تمدنی، سیاسی اور تعمیری کارناموں سے لوگوں کو واقف کرائیں، اس ملک میں مسلمانوں نے جو تعلیمی، صنعتی، زرعی اور تعمیری انقلاب برپا کیا جس کی روشنی سے آج تک ہندستان روشن ہے اس سے ہر عام وخاص کو واقف کرائیں، لوگوں کو یہ باور کرائیں کہ بھارت میں بسنے والی اقوام نے تہذیب ومعاشرت کی اولین جھلکیاں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہی دیکھی ہیں، وہ کھانے پینے اور لباس کی لذتوں سے مسلمانوں کے سبب ہی آشنا ہوئی ہیں، پھلوں اور پھولوں، نوع بہ نوع کی زرعی معلومات اور صنعتی تنوع اس ملک میں مسلمانوں کا ہی فیضان ہے، ہمارے شعلہ بیان مقررین بھی اپنی تقریروں میں جب مسلم سلاطین کے کارنامے بیان کرتے ہیں تو لال قلعہ وجامع مسجد اور تاج محل کا تذکرہ ہی ان کے لیے کافی ہوتا ہے، لیکن صرف اس رخ پر محنت کرنے سے ہی مسائل حل نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ تاریخ کو مسخ کرنے کے فیصلے سیاست کے ایوانوں میں ہوتے ہیں، اور سیاسی بالادستی حقائق کو مغلوب قوموں کے ملبوں میں ہی دبا دیا کرتی ہے، اگر چہ مسلمان جب اس ملک بلکہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں فاتح بن کر داخل ہوئے تو انہوں نے مغلوب قوموں کو سہارا دے کر اٹھایا، ان کو ترقی اور عروج کی ابجد سے واقف کرایا، خود بھارت میں بھی اندھیروں کو اجالوں میں بدلنے کا ہنر دیا، لیکن اس حقیقت کو نقش در و دیوار کرنے کے لئے یقیناً سیاسی بالادستی کی ضرورت

ہے، یہ بالا دستی اس لئے بھی ناگزیر ہے کیوں کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے، یقیناً اسلام میں اقتدار مقصود اصلی نہیں مگر اس کی ضرورت سے بھی انکار ممکن نہیں، اگر اسلام کو اقتدار کی ضرورت نہ ہوتی تو خیر کی تبلیغ اور منکرات سے روکنے کے لیے امر و نہی کا استعمال قرآن مجید میں نہ ہوتا، امر و نہی میں خود بالا دستی، بلندی و استعلا کے معنی پوشیدہ ہیں اور یہ سبق دیتے ہیں کہ ہمیشہ کمزور رہ کر نہ کسی چیز کا حکم کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی چیز سے روکا جاسکتا ہے۔

اسلام ایک مکمل دین اور کامل ضابطۂ حیات ہے تو یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ جزئی واقعات سے استدلال کیا جائے اور جزئیات میں الجھ کر اس کے تصور کمال کو پس پشت ڈال دیا جائے، کہیں علوم کی تقسیم کر کے زندگی کی ضروریات سے منھ موڑ لیا جائے، بجائے اعدادِ قوت کے قرآنی حکم پر عمل کرنے کے اور علوم وفنون کے شکار کرنے کے ان ہاتھوں کا سہارا لیا جائے جو خیر کے لئے اٹھتے ہی نہیں، اس نظام سے امید لگائی جائے جس کی بنیاد ہی شرک و باطل پر ہے، ہمیں اس حیثیت سے اسلام کو سمجھنا پڑے گا اور پھر زندگی کو زندہ دلی کے ساتھ گزارنے کے لئے اسی کی تبلیغ و تیاری میں لگنا پڑے گا، کیوں کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے، محض ۲۳ سال کے عرصہ میں حضرت محمد ﷺ نے جو اسلامی انقلاب برپا کیا تھا، اس انقلاب کی اپنی زمین تھی اور اپنا آسمان تھا، اس انقلاب نے ایک اجتماعی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی نظام دیا تھا، اس انقلاب نے خدا ترس اور عملیت سے بھرپور افراد کی ایک کھیپ تیار کر دی تھی، اس انقلاب کی بدولت ایک متحدہ قومیت، متحدہ سلطنت وجود میں آئی تھی، اس انقلاب نے شرعی قانون کے ساتھ اخلاقی نظام کو برپا کیا تھا، آپ ﷺ جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو دین مکمل ہو چکا تھا اور آپ ﷺ تکمیل دین و اتمام نعمت کا یہ اعلان حجۃ الوداع میں فرما چکے تھے، لیکن ہماری تفریق و تقسیم اور نظریاتی بحثوں نے اس جامع تصور پر غور کرنے کا موقع نہ دیا، یا یہ کہیے کہ اصل الاصول پر توجہ کرنے سے غافل کر دیا، میں یہاں ایک اقتباس نقل کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں جسے علامہ سید سلیمان ندوی نے یہ کہتے ہوئے نقل کیا ہے کہ پروفیسر مارگولیتھ جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے، لکھتے ہیں: محمد ﷺ کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپؐ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا''۔ (سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۲۹۲)۔

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

❑ خاص تحریر

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

اسلام کا مقصدِ جنگ اور حلب میں شامیوں، ایرانیوں اور روسیوں کی جنگ- ایک موازنہ

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

ہمیشہ ایسا ہوتا آیا ہے کہ جب بھی کوئی روشنی نمودار ہوتی ہے، تاریکی اس کو نگلنے کی کوشش کرتی ہے، جب بھی بہار کا موسم آتا ہے، اور کلیاں کھلتی ہیں اور پھول مہکتے ہیں تو خزاں کا بہار پر حملہ ہوتا ہے، جب بھی دنیا کے کسی گوشہ میں حق کا آوازہ بلند ہوتا ہے تو باطل اس پر حملہ آور ہوتا ہے، نور وظلمت کی یہ کشمکش بہار اور خزاں کی آویزش، حق اور باطل کا معرکہ دنیا کی تاریخ میں موجود رہا ہے، اسلام تاریخ انسانی کی سب سے بڑی روشنی اور سچائی ہے، لیکن اسلام کو بھی باطل کے ساتھ کشمکش کا سامنا کرنا پڑا ہے، کچھ لوگ اس نور حق کی حمایت کے لئے کھڑے ہوئے، اور انھوں نے ظلمت کی مخالفت میں امکان بھر حصہ لیا، اسی کوشش کا نام اسلام کی اصطلاح میں جہاد ہے، جہاد کا مقصد نہ تو ملک گیری ہے، اور نہ جہاں بانی کا حوصلہ دکھانا ہے، نہ توسیع پسندانہ پالیسی اختیار کرنا ہے اور نہ نوک شمشیر سے ملکوں کے جغرافیے بدلنا ہے، مقصد نہ مال غنیمت ہے نہ کشور کشائی ہے، بلکہ حق کی بلندی اور اس کی اشاعت کے لئے ہر قربانی اور ایثار کو گوارہ کرنا ہے، اور مخالفت کو توڑنا ہے، اور مخالفین کے حملوں کو روکنا ہے۔

جن لوگوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ کوئی بھی تحریک صرف اپنی حقانیت کے بل بوتے پر اور اصولوں کی پاکیزگی کی بنا پر کامیاب نہیں ہوتی ہے، بلکہ کامیابی کے پیچھے وہ جماعت ہوتی ہے، جو حق کی حمایت کے لئے عیش وآرام اور جان ومال کو داؤ پر لگا دیتی ہے، یہی مجاہدانہ ذوق ہے جو حق کی تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرتا ہے، مسلمانوں نے مکہ میں سخت ترین مظالم کو برداشت کیا، پھر ایک وقت وہ آیا کہ انہیں ہجرت کرنا پڑی لیکن مدینہ پہونچ کر بھی تلواروں کے سائے میں انہیں زندگی بسر کرنی پڑی، راتوں کو پہرہ دینا پڑا، اور انہیں اپنے مذہب اور اپنی سرزمین دونوں کا دفاع کرنا پڑا، حقیقت یہ ہے کہ حق کی راہ کٹھن ہے، یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے، اسی لئے انسان کو نرم وگرم دونوں قسم کے اخلاق کی حاجت ہوتی ہے، صبر اور ضبط، عفو ودرگزر بڑی خوبصورت اور قابل تعریف صفتیں ہیں، لیکن زندگی کے ہر نشیب وفراز میں کام نہیں دیتی ہیں، ایک انگریز مفکر نے بجا طور پر کہا ہے ''تحمل اپنی جگہ پر ایک اچھی چیز ہے لیکن تم اس کو تو برداشت نہیں کر سکتے جو تم کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اور تمہاری گردن قلم کر دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے''۔ نرم اخلاق ایک قابل تعریف اور مثبت صفت ہے، لیکن ہمیشہ زندگی کی باگ ڈور اس کے حوالے نہیں کی جا سکتی، انسان کو اور ہر جماعت کو اپنی تحریک کی کامیابی کے لئے نرمی

کے بجائے سختی، عدم تشدد کے بجائے تشدد کا طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے، دنیا کی تاریخ میں تلوار کو کبھی بالائے طاق نہیں رکھا گیا ہے، ہندو اوتاروں اور اسرائیلی سرداروں نے بھی اسے بے نیام کیا ہے، پیغمبروں کو بھی جنگیں لڑنی پڑی ہیں، یہ اس لئے کہ کبھی ایسی صورت حال پیش آتی ہے، کہ ہتھیار اٹھانا ایک اخلاقی ضرورت بن جاتا ہے، جب آزادی پر ہر طرف سے حملے ہونے لگیں، جب عبادت گاہیں خطرے میں پڑ جائیں، جب آبرو اور جان و مال کی کوئی قیمت باقی نہ رہ جائے تو محض تماشائی بن کر کے بیٹھا نہیں جاسکتا۔

اسلام نے حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لئے جنگ کرنا جائز قرار دیا ہے، یہ جنگ سلطنت وحکومت کی ہوس پوری کرنے کے لئے نہیں کی جاتی تھی، اسلام نے دین کی جبری اشاعت کی بھی ممانعت کی تھی، اور صاف کہہ دیا تھا کہ "لا اکراہ فی الدین" (البقرہ) یعنی دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے، دوسری جگہ قرآن میں ہے، انما علی رسولنا البلاغ المبین (المائدہ) یعنی ہمارے نبی پر یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف پیغام پہونچا دیں، لیکن ہوا یہ کہ پیغمبر کو طرح طرح کی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، پرامن تبلیغ کی بھی اجازت نہیں دی گئی، مدینہ ہجرت کرنے کے بعد بھی باطل قوتیں بار بار آپ پر اور آپ کے ماننے والوں پر حملہ آور ہوئیں، ایسی صورت میں بھی اگر آپ مقابلہ نہ کرتے اور تلوار نہ اٹھاتے تو دنیا کے لئے ایسی مثال پیش کرتے جس پر عمل کرنا ممکن نہ ہوتا، اس لئے اسلام نے ایک بلند مقصد کے لئے آخری تدبیر کے طور پر تلوار اٹھانے کی اجازت دی۔ اور ایک بار جب معرکہ گرم ہوگیا اور جنگ کی آگ بھڑک اٹھی تو باطل طاقتوں نے مسلسل سازش اور لڑائی کا وطیرہ اختیار کیا، چنانچہ فوجوں کو روانہ کرنے کا ایک سلسلہ شروع ہوا، اللہ تعالی نے مسلمان فوجوں کو فتح یاب کیا، اور دنیا کے بہت سارے ملک اسلام کے زیر نگیں آگئے، مسلمانوں نے جذبہ جہاد اور شوق شہادت کے ذریعہ دنیا کے بہت سے ملک فتح کئے، ان فتوحات کی داستان اسلامی تاریخ کے حیرت انگیز واقعات ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ فاتحین اسلام کے ایمان پرور اور جوش وحمیت سے لبریز واقعات کو مسلمانوں کی نئی نسل کے سامنے پیش کیا جائے۔

جہاد اسلام میں ایک فریضہ ہے، جہاد میں سب سے زیادہ ضروری چیز ڈسپلن ہے، انسان اگر غور کرے تو محسوس کرلے گا کہ اسلامی عبادات میں یہ ڈسپلن پورے طور پر ہے، نماز میں ڈسپلن اور فوجی تربیت کی شان موجود ہے، وقت کی پابندی فرض شناسی چستی اور محنت، صفوں کی ترتیب اور درستی اور ایک امام کی اطاعت یہ وہ ساری باتیں ہیں جن میں فوجی ڈسپلن موجود ہے، اور پھر جس طرح سے فوجی کیمپ لگتے ہیں اسی طرح سے جمعہ، عید اور حج کے موقع پر مسلمان ڈسپلن اور نظم وضبط کے ساتھ جمع ہوتے ہیں، اور جس طرح سے ایک فوجی تکلیف برداشت کرنے کی مشق کرتا ہے اسی طرح سے روزے میں بھی ایک مسلمان بھوک پیاس کی مشق کرتا ہے، گویا ایک مسلمان کی زندگی شروع سے آخر تک جہاد کی تربیت ہے، جہاد کا مقصد کسی سرزمین پر مخالفتوں کا زور توڑ کر کے دلوں پر اللہ کی حکومت قائم کرنا ہے، اور دنیا سے ظلم اور زیادتی کو مٹانا ہے، اور عدل وانصاف کو پھیلانا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرام نے تاریخ میں ایسے نمونے چھوڑے ہیں جن پر اگر دنیا عمل کرے تو ہمیشہ امن وامان قائم رہے، جہاد بمعنی قتال اگرچہ جنگ ہے لیکن اس کا مقصد خونریزی کا انسداد اور امن وامان کا قیام اور دین کے قبول کرنے کے معاملہ میں جبر کو ختم کرنا ہے، آنحضرت ﷺ کی تربیت سے ایسے بہادر، دلیر، جانباز سپہ سالار پیدا ہوئے جن کے کارنامے

دنیا کی تاریخ میں مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں، یہ مجاہدین یہ فاتحین یہ سپہ سالار تلوار کے دھنی تھے اور راہ خدا میں جان کے زیاں کو کچھ ایسا زیاں نہیں سمجھتے تھے، لیکن یہ تلوار کے دھنی کوئی ظالم وجابر فاتح نہ تھے، بلکہ انسانیت کے خادم تھے، اور بندگان خدا کے لئے خیر خواہ اور ہمدرد تھے، ان کے ہاتھوں سے ضرور کچھ لوگ مارے گئے لیکن اس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کے لوگ امن وامان کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں، زمین جور وستم سے پاک ہو اور اپنی مرضی سے جو دین اسلام قبول کرے اس پر ظلم نہ ہو۔ اسلام نے جنگ کی اجازت ضرورت دی ہے لیکن صرف ان لوگوں سے جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں یا آمادہ جنگ ہوں یعنی ارادہ جنگ رکھتے ہوں اور اشاعت دین میں مزاحم ہوں اور دین اسلام قبول کرنے والوں پر اور اپنی رعایا پر ہر ظلم روا رکھتے ہوں، حالت جنگ میں بھی کوئی صلح کی پیشکش کرے تو اسے قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور حالت جنگ کے وقت بھی اسلام نے وہ اخلاقی قوانین طے کردئے ہیں جو اس وقت پوری دنیا میں کہیں نہیں پائے جاتے تھے اور اب بین الاقوامی قانون جنگ میں اس کا عکس پایا جاتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا ہے۔ حضرت ابو بکر نے حضرت یزید بن ابی سفیان کو شام کے علاقہ کی ایک مہم پر روانہ فرمایا تو یہ نصیحتیں کیں: کچھ لوگ اپنی عبادتوں میں مشغول ہوں گے ان سے تعرض نہ کرنا، عورتوں کو، بچوں کو اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنا، کسی پھل دار درخت کو نہیں کاٹنا، کسی آبادی کو نقصان نہیں پہونچانا (صرف فوج سے لڑنا) اگر تمہاری فوج کو غذا کی کمی نہ پیش آجائے اور مجبوری نہ ہو تو کسی کی بکری اور اونٹ کو ذبح نہ کرنا، کسی باغ کو آگ نہ لگانا، کسی حال میں بدعہدی نہ کرنا اور کسی لاش کا مثلہ نہ کرنا۔

اسلام کے اس فلسفہ جنگ کا موازنہ اس جنگ سے کیجئے جو ایرانیوں اور روسیوں نے بشار جیسے ظالم اور خود سر کی حمایت میں اس وقت حلب میں شروع کر رکھی ہے، دنیا کے ملکوں نے تسلیم کیا ہے کہ ان طاقتوں نے جنگی جرائم کا ارتکاب کیا ہے حلب میں قیامت سے پہلے قیامت برپا ہو رہی ہے کھلے آسمان سے معصوم شہریوں پر بمباری اور ٹینکوں سے گولہ باری اور بکتر بند گاڑیوں سے آتش باری کے نتیجہ میں سیکڑوں کئی منزلہ عمارتیں ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی ہیں اور مال ومتاع خاکستر ہو رہا ہے کسی گھر سے کوئی آواز آتی ہے تو آہ وکراہ کی، زخمیوں کی فریاد کی، نالہ وشیون کی، کوئی اگر کسی شکستہ اور مسمار شدہ گھر سے زخمی حالت میں کسی کی مدد سے بچالیا جاتا ہے تو طبی مدد کے آتے آتے اس کا تار نفس ٹوٹ جاتا ہے اور اگر کوئی اس سیلاب بلا سے اور موت کے طوفان سے زندہ سلامت بچا ہوا ہے تو وہ بھی اپنی زندگی سے مایوس ہے اور اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو کہتا ہے کہ "الموت قادم الینا "موت جو مقدر ہے بس اس کے آنے کی دیر ہے، خون کے دریا میں کشتی جاں کو سلامت لے جانا مشکل ہے، ہمارے اہل وعیال موت کے منہ میں جاچکے اور ہم بھی اس دنیا کو چھوڑنے والے ہیں، یہ میرا آخری بیان ہے اس کے بعد تم میری آواز کبھی نہیں سن سکو گے''، اور صرف اتنا ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہے جس کا بیان کرنا مشکل ہے، حلب کا شہر نگاراں گنج شہیداں سے تبدیل ہوگیا ہے وہاں کے ایک ستم رسیدہ شخص نے دنیا کے علماء سے فتوی پوچھا ہے کہ ''ایران اور حزب اللہ اور بشار کے جابر وقاہر اور فاسق وفاجر فوجی ہمارے گھروں میں گھس کر زبردستی ہماری بیٹیوں کی عصمت ریزی کر رہے ہیں اور ہم بے بس ہیں، کیا اس ننگ وعار سے بچنے کیلئے یہ جائز ہوگا کہ ہم اپنی بیٹیوں کو مار ڈالیں ؟''۔ ملک شام میں موت کی بھیانک آندھی چل رہی ہے اور دنیا تماشہ دیکھ رہی ہے اور مذمت کے کچھ الفاظ بول کر اور لب ہلا کر رہ

جاتی ہے۔دنیا کی تاریخ میں چشم فلک نے جور وستم کے ایسے منظر کم دیکھے ہیں ،لوگوں کے پاس کھانے کو ایک دانہ نہیں ہے پینے کے لئے پانی نہیں ہے،کوڑے کے ڈھیر سے وہ اپنی غذا حاصل کررہے ہیں ،تاریخ میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ پورا شہر غلاظت کے ڈھیر سے اپنی غذا چن رہا ہو۔عیش وعشرت میں مشغول پڑوسی عرب اسلامی ملکوں میں یہ جرات نہیں کہ شام کو اس ظلم سے بچاسکیں اگر یہ عرب ملک بھی امریکہ اور روس کی طرح طاقتور ہوتے تو مدداور مداخلت کی کچھ پوزیشن میں ہوتے۔ایک ترکی بچا ہے جو ہر وقت بڑی طاقتوں کے نشانہ پر ہے،دنیا اس بات پر متفق ہوچکی ہے کہ کسی مسلم ملک کو ابھرنے نہیں دینا ہے ،بلا استثناء خلیجی اور غیر خلیجی حکمرانوں کا جرم یہ ہے کہ دولت کی فراوانی کے باوجود انہوں نے ملک میں صنعتی انقلاب لانے کی کوشش نہیں کی ، نہ سائنس اور ٹکنولوجی کے میدان میں ان کی کوئی پیش رفت ہوئی اور نہ انہوں نے اپنے عوام کو اظہار خیال کی وہ آزادی دی جو اسلام نے عطا کی تھی،انہوں نے اپنے عوام کو بے زبان جانوروں کی طرح بنا کر رکھا ہے ، اوروہ بس ہوس رانی اور عیش ونشاط میں مگن رہے۔اور دنیا مسلمان ملکوں کو پامال کرتی رہی ،روندتی رہی،اوران پر ظلم کے پہاڑ توڑتی رہی،لیکن ملک شام کے حکمراں کا ظلم سب سے سوا ہے اوراس ظلم کو سب سے زیادہ مدد اور طاقت ایران کی نام نہاد اسلامی حکومت سے ملتی رہی ،ایران کا یہ وہ جرم ہے جسے تاریخ معاف نہیں کرسکے گی ،ایران کے بے شمار شیعی مجتہد علماء الجزیرہ ٹی وی پر یہ بیان دے چکے ہیں کہ شام کے سلسلہ میں ایرانی حکومت کا موقف امام حسین کے روح جہاد کے مغایر ہے، یہ یزید کی ہمنوائی ہے لیکن ان کو اپنے ملک کے اندر اظہار خیال کی آزادی حاصل نہیں ہے، ایرانی لابی کے وہ ہندوستانی صحافی بھی مجرم ہیں جو سطور میں اور کبھی بین السطور میں بشار الاسد کی حمایت کرتے ہیں اور جب ظلم کی حمایت سے دل سیاہ ہوجاتا ہے تو ہر ظلم کی حمایت ان کا شیوہ بن جاتا ہے، وہ اس ظلم کے بھی طرف دار اور حامی بن جاتے ہیں جسے حکومت جمہوریت کے دعوے کے باوجود غیر جمہوری طور پر ذاکر نائک پر روا رکھتی ہے۔ ایرانی لابی کے ایسے تمام صحافیوں کا بائیکاٹ کرنے کی ضرورت ہے۔

بشار الاسد اور اس کے باپ حافظ الاسد دونوں نے شام میں اسلام پسندوں کو اور جمہوریت پسندوں کو ظلم کا نشانہ بنایا،اسلام نے ظلم کے خلاف کھڑا ہونا سکھایا ہے جس کی ابتدا واقعہ کربلا سے ہوتی ہے۔دنیا میں مسلمانوں نے طویل عرصہ تک حکومت کی ہے، ہمیشہ انصاف اور رواداری اسلام کی تاریخ کا طرہ امتیاز رہا ہے، اسلام کا مقصد جنگ انصاف کی بنیادوں کو مضبوط کرنا ہے،تاریخ میں مسلمان فاتحین نے مفتوح ملکوں میں سب کو مذہبی آزادی دی، نہ رسم ورواج میں مداخلت کی نہ کسی کا پرسنل لا بدلا نہ غیر مسلموں کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا،مسلمانوں نے اگر ایسا کیا ہوتا جیسا عیسائیوں نے اندلس میں کیا تو مفتوح ملکوں میں کوئی غیر مسلم نظر نہیں آتا ، بہت سے مفتوح ملکوں میں آج بھی اکثریت غیر مسلموں کی ہے ، جیسے ہندوستان میں، یہ اسلام اور مسلمانوں کی رواداری کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔مسلمانوں کا میدان جنگ میں قدم رکھنا شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا تھا اور اپنی جان ومال اوراپنے گھر اور عیش وآرام کو اللہ کی راہ میں قربان کرنا تھا اور یہ صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے تھا،اسلام کے خلاف جبر وقہر کو ختم کرنے کے لئے تھا، جب وہ میدان جہاد کے لئے نکلتے تھے تو زبان حال سے کہتے تھے:

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

☆☆☆

❑ پیام سیرت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دیوانہ غلام

محمد فرید حبیب ندوی
Mob. 9012621589

"أشهد ان محمداً رسول الله"

آج کی صبح مدینہ کی ایک تاریخی صبح تھی۔

مدینہ کا بچہ بچہ اس صبح کے نظارہ کو بے تاب تھا۔

پرندے آج معمول سے پہلے ہی چہچہانے لگے تھے۔

مسجد نبوی کے در دیوار-منبر ومحراب تڑپ رہے تھے۔

آج محمد رسول اللہ کا ایک دیوانہ آرہا تھا.....محمد کا ایک غلام .....ایک مستانہ غلام.....فرزانگی جس کی پہچان تھی.....وارفتگی جس کا امتیاز تھی.....اور.....محبت جس کی شناخت.....بلکہ وہ خود محبت کی شناخت بن چکا تھا۔

ہر ایک اس کے لئے فرش راہ تھا۔

ہر کوئی اس کے استقبال کو بے چین و بے قرار۔

وہ ایک پرکشش آواز رکھتا تھا..... بلا کی کشش تھی اس کی آواز میں۔

عجیب ساز یرو بم تھا اس کی صوت وآہنگ میں۔

اس کی آواز میں مقناطیسیت تھی .....درد تھا..... گداز تھا .....سوز وساز تھا.....اور سب سے بڑھ کر.....اس میں یقین کا نور تھا۔

اس کی جادو بھری .....اور..... پرشکوہ آواز باطل کے لئے کسی تیغ براں سے کم نہ تھی۔

اس کی آواز سن کر کلیجہ کو تھامنے کے لئے بھی "کلیجہ" چاہیے تھا۔

برسوں پہلے وہ یہ شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا.....کئی سال بعد وہ آج آرہا تھا۔

آ۔کیا رہا تھا.....اسے لایا جارہا تھا۔

وہ تو یہ قسم کھا کر گیا تھا کہ اب کبھی مدینہ واپس نہیں آؤں گا۔

جب مدینہ والا ہی نہ رہا.....تو یہاں کس کے سہارے رہوں گا۔

مدینہ کی ہر چیز اس کی یاد دلائے گی۔اس کی گلیاں.....اس کے در و دیوار.....اس کے کھیت و باغات..... ہر ایک چیز۔ نظریں اس کے دید کے لئے اٹھیں گی.....اور جب وہ سامنے نہ ہوگا.....تو.....

اس کے بعد کا تصور ہی اس کے لئے جان لیوا تھا۔

اس کا حال بقول اقبال کچھ یوں تھا:

''دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب''

کیا لطف انجمن کا، جب دل ہی بجھ گیا ہو''

''وہ''اس کا''دل''تھا.....جو،اب اس کے پاس نہ رہا تھا۔

اس لئے وہ یہ شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

لیکن اب اسے بلایا جارہا تھا۔

اور.....اس کے نہ آنے پر اس سے شکوہ شکایت کی گئی تھی .....اسے احساس دلایا گیا تھا۔

''کیا بات:تم ہم سے ملنے نہیں آتے.....تمہیں ہماری یاد

نہیں ستاتی ؟.....؟.....''

خواب میں اس کا محبوب اس سے شکوہ کناں تھا.....۔

وہ اس کے تصور سے باہر ہی کب نکلا تھا ..... جو اُسے بھلانے کی بات کی جاتی .....وہ تو اس کے رگ وریشہ میں سمایا تھا.....وہ تو اس کی روح میں بسا تھا۔

اس لئے یہ شکوہ اس کے لئے کسی طوفان قیامت سے کم نہ تھا۔

بس پھر کیا تھا، اس کی ہچکیاں بندھ گئیں.....وہ پرانے زخم تازہ ہو گئے.....ساری یادیں پردۂ ذہن پر ابھرنے لگیں..... اسکی وہ ملاقاتیں.....عنایتیں.....نوازشیں.....سب یاد آنے لگیں..... وہ اس کی آنکھوں کا قرار تھا..... وہ اس کی زندگی تھا.....اس کے لئے وجہ سکون تھا..... بلکہ اس کی زندگی کا سہارا.....۔

اس کے بغیر تو وہ ایک لمحہ بھی نہ گذار سکتا تھا.....مگر.....یہ اس کے بس میں تھا کہاں؟..... اس کے محبوب کو پہلے بلا لیا گیا تھا..... ابھی اسے اور تڑپانا تھا.....لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدائے اسلام کی زندگی زیادہ کٹھن تھی.....جب درندہ صفت انسان اس کے نازک جسم پر اپنی درندگی کو آزماتے تھے.....مگر اس کے صبر وتحمل کے سامنے خود کو بے بس ولاچار محسوس کرتے تھے۔

مگر مجھے لگتا ہے اس کے لئے اصل قیامت تو یہ جدائی تھی..... پہلے تو جسم زخمی ہوتا تھا.....اور روح کو قرار ملتا تھا..... مگر اب تو روح زخمی تھی..... دل زخمی تھا..... پورا باطن زخمی تھا.....جسم کی کھال تو دشمنوں نے پہلے ہی اتار لی تھی.....اب روح کی کھال اتاری جارہی تھی..... "لا یموت فیھا ولا یحیی" کی عملی تصویر تھی اس کی زندگی.....درد والم.....حزن وغم کا عکس تھی اس کی زندگی.....۔

جس کے سہارے اس نے بیسوں سال گذارے تھے..... جس کے رخ زیبا کا دیدار اس کے ہر زخم کا مرہم تھا.....جس کے ''دو بول'' اس کے ہر درد کا درماں تھے.....اب اسی کے دید کو نگاہیں تکتی تھیں.....انہی ''دو بول'' کو کان ترستے تھے.....۔

آج جب اس نے یہ خواب دیکھا.....تو یہ ساری یادیں تازہ ہو گئیں.....وہ دیوانہ وار..... پاگلوں کی طرح.....مدینہ کی طرف چل پڑا۔

سفر خاصا لمبا تھا..... شام سے مدینہ تک کا سفر تھا..... اب جدائی کا ایک ایک لمحہ عذاب سے کم نہ تھا..... ماہی بے آب اور مرغ بسمل کے سارے انداز آج پھیکے تھے..... سارے محاورے کم پڑ گئے تھے.....اس کا پورا وجود بے کل اور بے چین تھا۔

جیسے تیسے سفر تمام ہوا.....اور جیسے ہی مدینہ میں قدم رکھا .....دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں..... سانس تھمنے لگا..... قدم بے تابانہ روضہ کی طرف بڑھ گئے.....پھر کیا تھا.....آنسوؤں کا سیلاب.....اشکوں کی بوچھار..... ہچکیوں کا شور.....اور دھڑکنوں کی آواز.....۔

اور بس خاموشی.....۔

یہ تھے موذن رسول.....سید الاسلام والمسلمین.....حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ۔

وفات رسول کے بعد یہ مدینہ چھوڑ کر ملک شام میں جا بسے تھے۔

مدینہ کی ویرانی انہیں کاٹ کھانے دوڑتی تھی۔

اور یہ ویرانی صرف اس بات کی تھی.....کہ اب مدینہ میں وہ نہ رہا تھا.....جس کے دم سے مدینہ، مدینہ تھا۔

خواب میں رسول اللہ ﷺ نے ان سے دوری کی شکایت کی ،تو آج دوڑے چلے آئے۔

اور جب مدینہ کو ان کی آمد کی اطلاع ملی.....تو خود مدینہ ان کے استقبال کو امڈ پڑا۔

یہ مؤذن رسول تھے.....اب جب مدینہ آئے تو کان ان کی اذان کے مشتاق ہو گئے .....حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے فجر کی اذان کی فرمائش کر دی.....محبوب کے نواسوں کی فرمائش ان سے رد نہ ہو سکی.....ویسے تو ان میں ہمت نہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی عدم موجودگی میں اذان دے سکیں..... پہلے جب اذان دیتے تھے تو ان کا سراپا نگاہوں کے سامنے ہوتا..... مگر اب.....اب..... کیسے وہ اذان دے سکیں گے..... جب وہ ہی نہ ہوگا تو آواز کیسے ساتھ دے گی.....لیکن پھر بھی.....وہ ان کی فرمائش ٹال نہ سکے۔

آج لوگ انہی کی اذان سننے کو بے تاب تھے۔

اور ذرہ ذرہ گوش بر آواز تھا۔

سانسیں تھم سی گئی تھیں۔

وقت ٹھہر سا گیا تھا۔

ایک بار پھر سب اسی آواز کے لئے بے قرار تھے..... چرند پرند..... شجر حجر..... شمس و قمر..... سب کے سب آج پھر سے.....سالوں کے بعد اس اذان کے لئے بے چین تھے..... جو باطل کے ایوانوں میں لرزہ پیدا کر دیتی تھی..... جو اسلام کی قوت و شوکت کا مظہر تھی..... اور نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے تھے تہہ و بالا۔

اور اب جو اس نے اذان شروع کی ہے..... قیامت بپا ہو گئی.....دل بے قابو ہو گئے.....آنکھیں آزاد ہو گئیں.....عہد مبارک نظروں میں گھومنے لگا..... سارے زخم ہرے ہو گئے.....اور پھر..... جو اس نے..... درد و کرب سے بھری آواز میں.....اشھد ان محمدا رسول اللہ کہا.....

لوگوں کی چیخیں نکل گئیں.....نگاہیں بے اختیار روضہ کی طرف اٹھ گئیں ..... پورا شہر آہ و فغاں میں تبدیل ہو گیا.....عورتیں بے تابانہ گھروں سے باہر نکل آئیں۔

رسول اللہ کی وفات کے بعد ایسا منظر لوگوں نے کبھی نہ دیکھا تھا.....۔

یہ تھا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا عشق رسول .....جن کے بارے میں اقبال نے کہا:

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے؟
رومی فنا ہوا..... حبشی کو دوام ہے۔

جن کی محبت بے نظیر تھی.....جن کا ایمان و یقین بے مثال تھا.....۔

جن کی زندگی اسلام کی تصویر تھی۔

جن کی حیات فانی کا لمحہ لمحہ ''توحید کی پکار'' تھا۔

جن کی زندگی محبت سے عبارت تھی۔

غلام تھے.....مرکز حقارت تھے..... پر جب غلامِ سید کونین بنے تو آقاؤں کے آقا اور رشکِ ملائکہ بن گئے۔

ان کا یہ واقعہ ہم سے ایک سوال کرتا ہے:

''بلال کے نام لیوا آج ''روح بلالی'' سے محروم کیوں ہیں؟

کیوں ان کی محبت میں وہ سچائی نہیں؟؟

سلام ہو تیری تربت پر اے بلال!! .....قربان تیری محبت پر.....جان نثار تیری صداقت پر.....اے بلال!! تو نے محبت کو عظمت عطا کی.....دنیا کی ہر محبت تیری محبت کے سامنے ہیچ و کم مایہ ہے.....اللہ تجھ پر کروڑوں برکتیں نازل فرمائے.....

اور اے کاش ہمیں بھی تیری محبت کا کوئی ذرہ نصیب ہو جائے!!.....آمین!!

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

مشترکہ خاندانی نظام کے بعض مشکلات اوران کا حل

محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ

نوٹ: فاضل مقالہ نگار نے مارچ/اپریل ۲۰۱۴ کے مشترکہ اور مئی ۱۴ء کے شماروں میں ''مشترکہ خاندانی نظام، غور وفکر کے چند پہلو'' کے عنوان سے مقالہ رقم کیا تھا، میں نے اس مقالہ پر ایک نوٹ لکھا تھا اس میں متعدد سوالات قائم کیے تھے، قارئین ان شماروں کو دیکھ سکتے ہیں، اب مذکورہ مضمون میں فاضل صاحب قلم نے ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، لیکن اس مضمون میں زیادہ تر فقہی مسائل اور فتاوی نقل کیے گئے ہیں، حقیقی صورت حال سے اس کی تطبیق اب بھی ایک سوال ہے، بلکہ تجربات کی رو سے ان فتاوی پر عمل اچھے خاصے متدینین کے لیے بھی مشکل ہے، مشترکہ خاندانی نظام اکثر دیکھا گیا ہے کہ تب تک ہی چل پاتا ہے جب تک آپسی مفاہمت سے کام لیا جاتا ہے ورنہ واقعات بڑے تلخ ہیں جو روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہیں، بہرحال مقالہ نگار نے فقہ اسلامی کی روشنی میں بہتر رہنمائی کی ایسی کوشش کی ہے جو کسی حد تک ہمارے لیے رہنمائی کا کام دے گی، جزاہ اللہ۔ (مدیر)۔

تمہید:

یہ حقیقت ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام میں معاشرتی اور سماجی اعتبار سے بہت سے فوائد بھی ہیں، اس نظام میں خاندان کے کمزور اور بے سہارا لوگوں کی مدد ہوتی ہے، بیوہ، مطلقہ اور یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی بہتر طور پر پرورش ہوجاتی ہے، محتاج شخص کی لڑکیوں کی شادی بیاہ میں سارے خاندان کے لوگ معاون اور مددگار ہوجاتے ہیں اور اس ذمہ داری سے سبک دوش ہونا آسان ہوجاتا ہے، تو دوسری طرف بوڑھے ماں باپ کو سہارا مل جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں بہت کچھ مفاسد بھی ہیں، اور یہ مفاسد دینی، شرعی، سماجی معاشرتی اور مالی ہر اعتبار سے ہیں اور ان مفاسد سے مشترکہ خاندانی نظام کو پاک کرنا دشوار ہی نہیں، دشوار تر ہے۔

مشترکہ خاندانی نظام کے بعض مفاسد اور مشکلات: ذیل میں مشترکہ خاندانی نظام کے مشکلات ومفاسد پیش کئے جارہے ہیں یہ مفاسد اور مشکلات وہ ہیں جن سے ہم چشم پوشی نہیں کرسکتے۔

(۱) مشترکہ خاندانی نظام میں ہر ایک کی ملکیت و مالیت کا الگ حساب نہیں رہتا جبکہ شریعت کے بہت سارے احکامات بلکہ ساری مالی عبادات مثلاً زکوۃ قربانی اور صدقہ فطر کا وجوب ہر ایک کی ملکیت کے الگ حساب پر موقوف ہے۔ نیز وراثت کا حکم جاری کرنا بھی ہر ایک کی ملکیت کے الگ حساب پر مبنی ہے۔ راقم السطور کا مشاہدہ ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام میں اگر کوئی فرد دینی مزاج رکھتا ہے اور وہ اپنی مالیت کی زکوۃ ادا کرنا چاہتا ہے تو مال کے مشترک ہونے کی وجہ سے اور گارجین اور مالک کے دینی مزاج نہ ہونے کی وجہ سے اس مشترک مال کی زکوۃ ادائیگی بہت کم ہوجاتی ہے۔

(۲) ایک بھائی کی اولاد زیادہ ہے، ایک کی کم، تو ایک کا خرچ زیادہ ہے دوسرے کا کم، اور کام وآمدنی دونوں کی برابر، تو اس صورت میں ایک کا نقصان وحق تلفی ہے۔ اگر بھائیوں میں اتحاد و یگانگت ہے اور ان میں آپسی محبت ہے تو خیر یہ مسئلہ زیادہ اہم نہیں ہوتا اور اس کی فیلنگ کم ہوتی ہے اور اس چیز کو نظر انداز کردیا جاتا ہے، لیکن عورتیں جو مختلف ماحول اور مزاج کی ہوتی ہیں وہ اس چیز کو برداشت نہیں کرپاتی ہیں اور آئے دن اس معاملہ پر ہنگامہ آرائی ہوتی ہے اور وہ عورتیں جن کے بچے کم ہوتے ہیں اور جن کے کھانے

والے کم ہوتے ہیں وہ کثیر الاولاد بھائی کے بچوں کو ٹھہری نظروں سے دیکھتی ہیں اور یہ معاملہ آئے دن ایک معاملہ بنا رہتا ہے۔

(۳) اگر والدین کی حیات میں کسی بھائی کا انتقال ہو گیا تو اس کی اولاد اور بہو ترکہ سے محروم ہو جاتے ہیں، مرنے والا چونکہ باپ کا معاون تھا اس لئے اس کا کوئی ترکہ ہی نہ تھا جو اس کے بیوی بچوں کو دیا جائے اور جب والد کا انتقال ہو جاتا ہے تو پوتے اور مرحوم کی بیوہ محروم و محجوب ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ مرحوم شروع سے الگ رہتا ہے تو اس کا ترکہ اس کے بیوی بچوں کو ملتا ہے۔

(۴) اگر کئی بھائی ہیں، ایک بھائی کھیتی کرتا ہے اور پیداوار گھر میں کھانے پینے میں خرچ ہوتی ہے اور دوسرے بھائی گھر سے باہر ملازمت پر ہیں جو وقتاً فوقتاً خرچ بھیجتے رہتے ہیں اور وہ گھر میں صرف ہوتا رہتا ہے، اور گھر آتے ہوئے گھر کی ضرورت کی کوئی چیز خرید کر لاتے ہیں۔ اب جب علیحدگی ہوئی تو وہ چیزیں جو بھائی خرید کر لائے تھے انہوں نے اس پر قبضہ کر لیا کہ یہ ہم نے ذاتی آمدنی سے خریدی ہے، اگر یہ شرکت کی چیز سمجھی جائے گی تو ہمارے ذمہ اتنا قرض بھی ہے وہ بھی شرکت کا ہوگا، اس موقع پر مسئلہ کا حل کرنا مشکل ہوتا ہے۔

(۵) مشترکہ خاندان میں عموماً یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ مثلاً چار بھائی ہیں، ایک تجارت کرتا ہے، ایک ملازمت کرتا ہے، ایک کھیتی کرتا ہے، ایک کم عمر اپنی بساط کے مطابق گھر کا کام کرتا ہے، اب ہر ایک بھائی خفیہ طور پر اپنے پاس کچھ رقم جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس میں دوسرے کا نقصان اور حق تلفی ہے۔

(۶) اس نظام میں گھر کے تمام افراد کے لیے یکساں کھانے پینے کا نظم کیا جاتا ہے، جبکہ بھائیوں کی آمدنیاں مختلف ہیں بعض بے روزگار ہیں لیکن سب کو برابر رکھنے کی وجہ سے اس بھائی کی عورت کی حق تلفی ہوتی ہے جس کے شوہر کی آمدنی زیادہ ہے کیوں کہ عورت کا نان ونفقہ مرد کی حیثیت کے مطابق واجب ہوتا ہے۔

(۷) مشترکہ خاندانی نظام میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض افراد روزی روٹی کے حصول کے لئے زمانہ دراز تک گھر سے باہر رہتے ہیں خاص طور وہ لوگ جو خلیجی ممالک میں رہتے ہیں دو سال تین سال بلکہ بسا اوقات چار چار سال تک گھر نہیں آتے اور پیسوں کے لالچ کی وجہ سے بیویوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہوتی ہے۔ گھر والے بھی چاہتے ہیں جتنی تاخیر سے آئے بہتر ہے کیوں کہ وہ وہاں سے مال و دولت روپیہ پیسہ کی شکل میں اور درہم وریال کی شکل میں بھیج رہا ہے اور ادھر کچھ لوگ گھر کا کام وکاج دیکھتے ہیں، بہت سے ایسے واقعات پیش آئے اور آئے دن پیش آرہے ہیں کہ بہت سی ایسی عورتوں کا جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اپنی عزت وآبرو کو بیچ دیا اور پھر پورے خاندان کی رسوائی اور جگ ہنسائی ہوئی۔

(۸) مشترکہ نظام میں فضول خرچی اور لاپرواہی عام بات ہے، مالی معاملہ مشترک ہونے کی وجہ سے ہر شخص اسے مالِ مفت سمجھ کر بے دلی سے خرچ کرتا ہے۔

(۹) مشترک نظام میں گھر کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے، حالانکہ گھر کو سکون اور اطمینان کی جگہ ہونا چاہیے۔

(۱۰) غیر محرموں سے پردہ کا اہتمام نہیں ہوتا۔

(۱۱) موروثی جائداد شریعت کے مطابق وقت پر تقسیم نہیں کی جاتی جس کی بناء پر بعد میں بہت سے مسائل کھڑے ہوتے ہیں۔

(۱۲) حساب وکتاب میں شفافیت نہیں ہوتی جس کی بناء پر دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے اور لڑائی جھگڑے کی آئے دن نوبت آتی ہے اور دل میں نفرت وکدورت جنم لیتی ہے۔

(۱۳) کمانے والوں کی تعداد کھانے والوں سے کم ہوتی ہے اور بہت سے لوگوں میں دوسروں پر انحصار کا مزاج بن جاتا ہے اور ایسے لوگ سماج کے لئے عضوِ معطل بنے رہتے ہیں۔

(۱۴) مشترکہ خاندانی نظام کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اس نظام میں جنسی تعلق کے حوالے سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، انسان کے لئے لیے بے تکلف اور خوش گوار ازدواجی زندگی گزارنا

مشکل ہوتا ہے۔ حالانکہ نگاہ کی حفاظت اور عصمت وعفت کے لئے ضرری ہے کہ مرد اپنی خواہش کے مطابق دن رات کے جس حصے میں چاہے اپنی ضرورت پوری کرے اور احادیث میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

(۱۵) مشترکہ خاندانی نظام میں عام طور پر خوش دلی کا جذبہ مفقود ہوتا ہے، سماجی اور معاشرتی دباؤ اور شرماحضوری میں لوگ اس نظام سے بندھے رہتے ہیں۔

مشترکہ خاندان میں گھر کے اخراجات کیسے تقسیم: اگر مشترکہ خاندان ہو اور افراد خاندان کی ضروریات کے لئے سب مل کر خرچ دیں، کسی بھائی کے بچے زیادہ ہوں اور کسی کے کم، تو کیا ان سب پر برابر اخراجات عائد کئے جائیں گے یا ان کے بچوں کی تعداد کے لحاظ سے؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مشترکہ خاندانی نظام کی اصل اور بنیاد باہمی تعاون اور ایثار وقربانی پر ہے ورنہ یہ خاندانی نظام قائم ودائم نہیں رہ سکتا، اس کے ساتھ ہی عدل وانصاف کو قائم رکھنا بھی ضروری ہے، لہذا اگر خاندان کے سبھی افراد باحیثیت اور صاحب استطاعت ہوں تو زیر کفالت افراد کی تعداد کے اعتبار سے اخراجات دیں گے، اور اگر کوئی مالی اعتبار سے کمزور ہو تو ہر شخص اپنی آمدنی کے تناسب سے اخراجات برداشت کرے گا۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کا اس مسئلہ میں یہی فیصلہ اور تجویز ہے، البتہ خاندان کے سبھی حضرات کو چاہئے کہ جائز ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی کوشش کریں تاکہ کمانے والوں پر بوجھ نہ پڑے۔

مشہور عالمِ دین اور اسکالر مولانا اختر امام عادل (فاضل دیوبند) اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

''ضابطہ کی بات تو بظاہر یہ لگتی ہے کہ جس کا خرچ زیادہ ہو اس پر زیادہ اخراجات عائد کئے جائیں لیکن مشترکہ نظام کی روح اور اس کے مقاصد کا تقاضہ یہ ہے کہ سب پر برابر اخراجات عائد ہوں، بچوں کی تعداد کا لحاظ ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ اس نظام کی بنیاد تعاون باہمی پر ہے تاکہ کوئی کمزور فرد کم آمدنی کی بنا پر زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے اور مالی دشواریاں اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہوں، مشترکہ نظام میں کوئی اپنی مالی قوت سے فائدہ پہنچاتا ہے تو کسی کی افرادی قوت کام آتی ہے، کوئی صحت سے کمزور ہوتا ہے تو کسی کی جسمانی صلاحیت اس کی مددگار ہوتی ہے، اگر باہمی تعاون وتناصر کا جذبہ مفقود ہوجائے تو سرے سے یہ نظام ہی ختم ہوجائے گا اور کوئی ضرورت نہیں رہ جائے گی اور کوئی ضرورت نہیں رہ جائے گی مشترکہ نظام کے اس ڈھیر سارے بکھیڑے کی۔ اگر ذمہ داریوں کے باب میں انفرادی اخراجات کا تناسب ہی ملحوظ ہو تو جداگانہ نظام ہی میں کیا قباحت تھی جو اس رسمی ونام نہاد مشترکہ نظام کے جھمیلے میں آدمی پڑے.....دراصل یہ مسئلہ عرف پر مبنی ہے، مشترکہ نظام کا معروف دستور یہی ہے کہ خاندان کا ہر فرد اپنی حیثیت کے مطابق اس میں حصہ لیتا ہے، اسی طرح رائج حقوق وفرائض میں بھی اس کی شرکت برابر کی ہوتی ہے، اس نظام میں آمد وخرچ اور افادہ واستفادہ کا تناسب نہیں دیکھا جاتا، بلکہ ہر شخص اس نظام کا حصہ ہوتا ہے اور ہر ایک اپنی طاقت بھر حصہ داری نباہتا ہے، پس ہر ایک کو اس نظام سے اپنی ضرورت کے مطابق فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے۔.....(مشترکہ وجداگانہ خاندانی نظام صفحہ ۱۲۶)۔

مشترکہ (خریدے ہوئے) سامان میں سبھوں کا حصہ کس اعتبار سے ہوگا؟ اگر مختلف بھائیوں نے مل کر اپنے والد یا کسی بھائی کے پاس آمدنی جمع کی اور گھر کے اخراجات سے بچی ہوئی رقم سے کوئی چیز خرید لی گئی تو اس میں سبھوں کا حصہ برابر ہوگا یا ایک ایک کی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا؟

صورتِ مسئلہ میں اخراجات کے بعد بچی ہوئی رقم سے خریدی گئی چیز میں سبھی افراد برابر کے حقدار ہوں گے جبکہ آمد وخرچ مشترک ہوں۔ مفتی انور علی لکھتے ہیں: اس میں سب کا حصہ برابر ہوگا اور

آمدنی کی کمی زیادتی کا اعتبار نہیں ہوگا۔ چنانچہ شرکت فاسدہ کے بیان میں علامہ شامی لکھتے ہیں: ''وکذا لو اجتمع اخوۃ یعملون فی ترکۃ أبیھم ونمی المال فھو بینھم سویۃ ولو اختلفوا فی العمل والرأی'' (ردالمحتار ۳۹۲/۶ مطبع دارالکتاب دیوبند)۔

فقہاء نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ہر ایسا مشترک معاملہ جہاں ملکیتیں مخلوط ہوں ان میں فرق وامتیاز نہ ہو جن میں فی صد کا تعین مشکل ہو وہاں تمام شرکاء کا حق برابر مانا جائے گا۔ علامہ شامیؒ نے مستقل عنوان ہی قائم کیا ہے۔ ''مطلب اجتمعا فی دار واحدۃ واکتسبا ولا یعلم التفاوت، فھو بینھما بالسویۃ'' اس طرح کی متعدد نظیریں اور مثالیں کتب فقہ میں موجود ہیں۔

حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ اسی طرح کے ایک مسئلہ میں فتویٰ دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارے سماج میں عام طور پر یہ بات معروف ہے، چند بھائی اجمالی خاندان کی طرح رہتے ہیں، ان میں کوئی زیادہ کماتا ہے کوئی کم، کوئی کماتا ہی نہیں، کوئی پڑھنے لکھنے میں مشغول ہے، کوئی کھیتی باڑی دیکھتا ہے، کوئی نوکری کرتا ہے۔ مشترک جائداد ہے، اس کی آمدنی بھی گھر پر صرف ہوتی ہے، کمانے والے کو نوکری یا تجارت سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ بھی گھر پر خرچ ہوتی ہے، کچھ عرصہ تک تو گھر بغیر حساب وکتاب بہت اچھی طرح چلتا ہے، لیکن پھر میں اور تو، میرے اور تیرے کا جھگڑا شروع ہوجاتا ہے، معاملات واضح نہیں رہتے کوئی شخص اپنی آمدنی سے حاصل جائداد کو اپنی ذاتی قرار دیتا ہے، دوسرے مشترک قرار دے کر اس میں حصہ کے طالب ہوتے ہیں، ان حالات میں سخت بگاڑ پیدا ہوتا ہے، اس لئے آپ کے لئے مندرجہ بالا حالات میں مشورہ یہ ہے کہ آپ دیگر بھائیوں کو بٹھا کر پورے معاملات صاف کر لیجئے اور پھر اپنی ذاتی آمدنی سے جو کچھ خریدنا ہو خرید لیجئے، اب تک جو کچھ حاصل ہوا ہے اسے مشترک مانئے۔ کس پر کم خرچ ہوا کس پر زیادہ ہوا یہ ہرگز نہ جوڑیئے۔'' (فتاویٰ قاضی ص ۲۳۶)۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زیر بحث مسئلے میں والد یا گھر کے گارجین کے پاس جمع شدہ رقم میں سب کا حق برابر ہوگا اور اس میں آمدنی کا فرق ملحوظ نہیں ہوگا، اس لئے اس جمع شدہ رقم سے جو چیز بھی خریدی جائے گی اس میں سب کا حصہ برابر ہوگا خواہ آمدنی سب نے برابر جمع کی ہو یا کم وبیش، البتہ ضروری ہے کہ یہ ساری آمدنی گھر کے خرچ کے لئے گھر کے مالک اور گارجین کے پاس جمع کی گئی ہو، اور اس باقی ماندہ رقم سے کوئی چیز خریدی گئی ہو۔

مشترکہ خاندان میں زیادہ کمانے والے بھائی کی زائد آمدنی کا حکم: اگر تین بھائی (مثال کے طور پر) ہیں، دو بھائی اپنی پوری تنخواہ مثلاً دس ہزار روپے گھر میں دیتے ہیں اور ایک بھائی بیس ہزار روپیہ کماتا ہے، وہ بھی دس ہزار گھر میں دیتا ہے اور دس ہزار بچا کر الگ رکھتا ہے، تو وہ بچی ہوئی رقم صرف اس کی ملکیت ہوگی یا تمام بھائیوں کی؟

صورتِ مسئلہ میں بچی ہوئی رقم صرف اس کی تنہا ملکیت ہوگی اس میں دیگر بھائیوں کا کوئی حصہ اور شیئر نہ ہوگا، کیوں کہ آمدنی کا یہ زائد حصہ مشترکہ نظام کے دائرے میں داخل نہیں ہے، یہ اس کی ذاتی ملک ہے جو اس نے اپنے لئے پس انداز کی ہے، مشترکہ نظام کے دائرے میں صرف وہ رقم داخل ہوگی جو اس غرض سے اس میں شامل کی جائے گی، بقیہ رقم کو الگ کرنا اس بات کا اشارہ اور علامت ہے کہ وہ اس رقم کو اس نظام کا حصہ بنانا نہیں چاہتا اور کسی کی مرضی اور چاہت کے بغیر اس کے مال پر تصرف جائز نہیں، شریعت اس کی اجازت نہیں دے گی، لہذا بچا ہوا مال اس کی ذاتی ملکیت قرار پائے گی اور اس پر کسی بھائی یا بہن کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

وزارۃ الاوقاف والشؤن الإسلامیہ (کویت) کے تحت قائم ''قطاع الافتاء والبحوث الاسلامیہ'' میں ایک شخص نے استفتا

بھیجا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس کی پندرہ سال سے کم عمر تھی، جب اس کے والد کا انتقال ہوگیا، تقریبا پندرہ سال کی عمر میں اس نے کویت جا کر کمایا اور پھر اپنی ذاتی کمائی سے ایک زمین خرید کر اس میں عمارت تعمیر کرائی جس کے تمام کاغذات وشواہد اس کے پاس ہیں، اس کے والد نے کچھ ترکہ چھوڑا تھا۔ اس نے بھائیوں سے جب میراث میں اپنا حصہ مانگا، تو بھائیوں نے کہا تمہاری اس عمارت میں ہمارا بھی حصہ ہے، پہلے تم اس میں حصہ دو۔ اس شخص نے پوری تفصیل مذکورہ ادارہ میں بھیجی، استفتاء کا جواب مع ترجمہ ملاحظہ کریں۔

أجابت اللجنة: "بأنه مادام المستفتي قد اشترىٰ الارض من ماله، وبنى عليها من ماله ولم يشاركه احد في أي عمل من اعمال العمارة فتكون ملكا خاصا له، وليس من حق أخيه أن يشاركه في اي قدر من الارض والبناء" (مجموعۃ الفتاویٰ الشرعیۃ ۴/ ۱۸۸ بحوالہ مشترکہ خاندانی نظام)

مستفتی نے اپنے پیسے سے زمین خرید کر اپنے پیسہ سے اس پر عمارت تعمیر کرائی ہے، اور عمارت کے کسی بھی کام میں کسی نے حصہ نہیں لیا ہے، تو وہ اس کی خاص ملکیت ہے، اور اس کے بھائی کو حق نہیں ہے کہ زمین اور عمارت میں کچھ حصہ دار بنے۔

مفتی انور علی صاحب صورت مسئلہ کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ''آمدنی کم وبیش ہونے کی صورت میں اشتراک کے وقت معاملہ واضح اور صاف ہونا چاہیے، مذکورہ بالا مسئلہ کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ بھائیوں میں صراحتا یہ طے ہوا کہ ہر ایک اپنی پوری کمائی مشترکہ نظام کے حوالے کرے گا، اس صورت میں بغیر بتائے بچا کر رکھنا خیانت ہے اور اس بچی ہوئی رقم میں سب حصہ دار ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ ساتھ رہنے والے تینوں بھائی آپس میں یہ طے کر لیں کہ ہم سب گھریلو خرچ کے لئے دس دس ہزار روپیہ دیں گے اور ہر ایک اس پر راضی ہے، دونوں بھائی یہ جانتے ہیں کہ تیسرے کی کمائی بیس ہزار روپیہ ہے، دس ہزار روپیہ دینے کے بعد بقیہ دس ہزار وہ بچا کر رکھتا ہے اس صورت میں وہ بچی ہوئی رقم تنہا ایک بھائی کی ہوگی، کیوں کہ اس تیسرے نے اپنی کمائی کا روپیہ دونوں بھائیوں کی مرضی سے بچایا ہے، ان کے درمیان ایسا کوئی معاہدہ نہیں تھا کہ ہر ایک اپنی پوری کمائی مشترکہ نظام کے حوالے کرے گا، بلکہ پہلے سے ایک دوسرے کی آمدنی کی مقدار جاننے کے باوجود یہ طے کیا گیا کہ ہر ایک دس دس ہزار روپیہ دے گا، مسئلہ کی ایک تیسری صورت بھی ہے کہ تین بھائی ایک ساتھ رہتے ہوں اور صراحتا کچھ طے نہ ہو تو اس صورت میں ایک بھائی کی بچی ہوئی رقم مشترک مانی جائے گی اور اس میں سب حصہ دار ہوں گے۔ (مشترکہ خاندانی نظام ۱۰۳-۱۰۴)۔

مشترکہ نظام میں گھر کا کام دیکھنے والے کا حصہ: اگر خاندان کے کچھ افراد کماتے ہیں اور کچھ گھر کے کام دیکھتے ہیں اور اس طرح گھر کا کام چلتا ہے تو کیا کمانے والے حضرات کی آمدنی میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حقدار ہوں گے؟

اگر مشترکہ خاندان کے سارے افراد کسی معاہدہ کے تحت کام کرتے ہوں تو اس صورت میں جو بھی آمدنی ہوگی وہ خاندان کے سبھی افراد کے درمیان معاہدہ کے اعتبار سے تقسیم ہوگی، خواہ وہ گھر پر کام کرتے ہوں یا گھر سے باہر۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر کاروبار ایک ہی ہو، کچھ لوگ گھر پر کام کرتے ہوں اور کچھ لوگ گھر کے باہر تو اس شکل میں بھی کل آمدنی تمام بھائیوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوگی۔ اس مسئلہ کی تیسری صورت اور مشکل یہ ہے کہ تمام بھائیوں کا کاروبار الگ الگ ہو اور ان کے درمیان کسی طرح کا باہم معاہدہ نہ ہوا ہو تو اس صورت میں باہر کمانے والوں کی آمدنی میں گھر کام دیکھنے والے حصہ دار نہیں ہوں گے۔

مفتی انور علی صاحب اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ''چند بھائی اگر ایک ساتھ رہتے ہیں تو فطری طور پر سب ایک جیسے نہیں ہو

سکتے اور سب ایک برابر کام نہیں کر سکتے، بڑے کاروبار کو سنبھالنے کے لئے چند بھائیوں کے درمیان تقسیم کار بھی ضروری ہے، مثلاً کوئی بھائی دکان پر بیٹھ کر لین دین کی ذمہ داری سنبھالتا ہے، کوئی مال کی سپلائی اور پیسے کی وصولی کے لئے بھاگ دوڑ کرتا ہے، کوئی فیکٹری میں مزدوروں کی نگرانی کرتا ہے، کوئی گھر کے کام کاج دیکھتا ہے، اس صورت میں کمائی سب کے درمیان مشترک ہوگی اور سب برابر کے حقدار ہوں گے، اس لئے کہ گھر کام دیکھنے والا ایک ذمہ داری سنبھال کر دوسروں کو کمانے کے لئے فارغ کرتا ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو انہیں کمانے کے لئے یکسوئی حاصل نہیں ہو پاتی۔ اس لئے وہ کمانے والے بھائیوں کی آمدنی میں برابر کا شریک ہوگا۔ (مشترکہ وجداگانہ خاندانی نظام صفحہ ۱۰۴)۔

مولانا اختر امام عادل (فاضل دیوبند) اس مسئلے کے ضمن میں لکھتے ہیں: ''مسئلے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: (الف) کوئی مشترک موروثی یا غیر موروثی کاروبار ہو جس میں کچھ لوگ کاروبار میں لگے ہوں اور کچھ گھر کے معاملات دیکھتے ہوں ایسی صورت میں کاروبار میں لگے افراد کی آمدنی میں گھر میں کام کرنے والے حضرات بھی برابر کے حصہ دار ہوں گے، اس لئے کہ گھر اور کاروبار دونوں کے شرکاء ایک ہیں اور صرف تقسیم کار کے اصول پر کام کو بانٹ دیا گیا ہے۔ (ب) لیکن اگر کوئی ایسا مشترکہ کاروبار نہ ہو، بلکہ تمام لوگ اپنے اپنے طور پر کام کرتے ہوں اور اسی میں سے کچھ رقم گھر کے خرچ کے لئے دیتے ہوں اور کچھ حسب سہولت پس انداز کر لیتے ہوں، ایسی صورت میں وہ رقم جو گھر کے خرچ کے لئے کمانے والوں نے دی ہے اس میں ظاہر ہے کہ سارے افراد کا برابر کا حصہ ہوگا لیکن جو رقم ان لوگوں نے گھر میں نہیں دی، بلکہ اپنے پاس رکھ لی، اس میں دیگر حضرات کا حصہ دار ہونا بہت مشکل ہے، اس لئے کہ جو مال انسان کی ذاتی ملکیت سے خارج نہیں ہوا اس پر دوسرے کا حق کیوں کر ثابت ہوسکتا ہے؟..... زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ گھر کے کام میں لگے ہوئے لوگوں کو آمدنی لانے سے مستثنیٰ (الگ) کر دیا جائے اور ان کی محنت کو دوسروں کی کمائی کا بدل قرار دیا جائے یعنی وہ بغیر کمائے ہوئے بھی گھر میں جمع ہونے والی آمدنی میں برابر کے حق دار ہوں گے لیکن کمائی کا وہ حصہ جو کمانے والوں کی جیب سے نکل کر گھر میں نہیں آیا وہ ظاہر ہے کہ ان کی نجی ملک ہے اس پر دوسروں کو حق دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔'' (مشترکہ وجداگانہ خاندانی نظام صفحہ ۱۳۰)۔

الغرض اگر مشترکہ خاندان میں گھر کے تمام افراد نے باہم مشورہ کر کے اگر کاروبار کی ذمہ داری کچھ حضرات کے سپرد کی اور گھر کے کام دیکھنے کی ذمہ داری کچھ حضرات سپرد کی اور وہ سب اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہ انجام دیتے ہیں تو طے شدہ نظام کے مطابق آمدنی میں وہ سب برابر کے حصہ دار ہوں گے، کیوں کہ گھر کی ذمہ داری سنبھالنے والوں نے ان کو امور خانہ داری سے بے فکر کر دیا تبھی تو وہ پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ اپنے کاروبار کو ترقی دے رہے ہیں۔

البتہ جو بھائی سستی اور کاہلی کی وجہ سے بیکاری کے عادی ہوں، کام چور ہوں، گھر پر پڑے رہیں اور کام کرنے والے بھائیوں سے صرف آمدنی وصول کریں وہ کاروبار کی آمدنی میں حقدار نہیں ہوں گے۔ فتاویٰ دارالعلوم میں ہے:

''اگر باپ کے ترکہ میں کئی بھائی تجارت اور کاروبار کریں اور اس کو بڑھا دیں تو وہ سب بھائی اس میں برابر کے حصہ دار ہیں، اگرچہ ان کا عمل اور کوشش مختلف ہو، لیکن جو بھائی اس کاروبار سے علاحدہ رہا اس نے کسی قسم کی بھی اعانت بھائیوں کے کام میں نہ کی اور کسی قسم کا عمل نہ کیا تو روایت بالا کے مفہوم سے معلوم ہوا کہ وہ اس میں شریک نہ ہوگا۔'' (فتاویٰ دارالعلوم ۱۳/ ۷۵)۔

مشترکہ خاندان اور والدین کی خدمت و کفالت: یہ حقیقت ہے کہ مشترکہ اور علاحدہ خاندانی نظام کی بحث حقوق کی ادائیگی سے جڑی ہوئی ہے، عام طور پر والدین جب بچوں کی شادی کی ذمہ داری سے فارغ ہو جاتے ہیں اور لڑکے اپنے اہل

وعیال کے ساتھ رہنے لگتے ہیں تو پھر والدین کے جانی و مالی حقوق میں دانستہ اور نادانستہ کمی آنے لگتی ہے اور پھر دونوں جانب سے شکوہ وشکایت کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

دوسری طرف یہ بات بھی عام ہے کہ شادی کے بعد یگر رشتہ داروں، یتیم و مسکین اور خواہر و برادر کی طرف لوگوں توجہ کم ہوجاتی ہے اوران پر دھیان کم ہونے لگتا ہے اور ایک طرف بچوں کے حقوق اور دوسری طرف اہل قرابت کے حقوق اور اس پر معاشی کمزوری کا دباو۔ اس صورتِ حال میں دن بدن مسائل پیدا ہوتے اور گھریلو ماحول پراگندہ ہونا شروع ہوجاتا ہے، اس مشکل کا حل اسلام کیا پیش کرتا ہے؟ اختصار کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔

مذہبِ اسلام اولاد پر والدین کی خدمت اور ان کفالت کی ذمہ داری عائد کرتا ہے، قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں بے شمار مواقع پر اس کی تفصیلات اور احکامات موجود ہیں۔ "وقضى ربك الا تعبدوا إلا اياه وبالوالدين احسانا" (الاسراء۲۳) اور تیرے پروردگار کا یہ فیصلہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ "ووصينا الانسان بوالديه احسانا" (عنکبوت۸) اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت کی۔ "وصاحبهما فى الدنيا معروفا" (لقمان۱۵) اور والدین کے ساتھ دنیا میں اچھا سلوک اور نیک برتاؤ کرو۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے پاس مال ہے اور میرے والد کے پاس بھی مال ہے، پھر بھی میرے والد میرا مال لینا چاہتے ہیں، آپؐ نے ارشاد فرمایا: تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے۔ (ابوداؤد کتاب البیوع)۔

بعض روایات میں اولاد کو انسان کی کمائی بھی قرار دیا گیا ہے۔ ''سب سے پاکیزہ رزق وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائے، اور اولاد بھی انسان کی کمائی ہے، پس ضرورت کے وقت اپنی اولاد کی کمائی کھاؤ معروف طریقہ سے۔''

والدین چونکہ ساری زندگی بچوں کی خدمت کرتے ہیں اس لئے اس کا لازمی تقاضہ ہے کہ جب والدین بوڑھے ہوجائیں اور انہیں خدمت وکفالت کی ضرورت ہو تو اولاد ہر طرح سے ان کی خدمت وکفالت کرے۔ شریعت مطہرہ نے ایسے وقت میں اولاد کو اس کا مکلّف بنایا ہے۔ حق تعالیٰ نے والدین کے ادب واحترام اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنے شکر کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے، جیسا کہ ''سورۂ لقمان'' میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو لازم قرار دیا۔

"أن اشكر لى ولوالديك" (سورۂ لقمان:۱۴) (یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم ہے اور اللہ تعالیٰ کے شکر کی طرح والدین کا شکر گزار ہونا واجب ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر والدین محتاج، ضرورت مند ہوں، ان کی کوئی کمائی نہ ہو اور نہ ان کے پاس مال ہو تو ان کی اولاد پر ان کی کفالت واجب ہے قال ابن المنذر: "اجمع اهل العلم على أن نفقة الوالدين الفقيرين الذين لا كسب لهما، ولا مال، واجبة فى مال الولد" (المغنى لابن قدامه ۱۱/ ۳۷۳)

البتہ جزئیات میں تھوڑا اختلاف ہے کہ احناف کے نزدیک ایسے باپ کی بھی کفالت اولاد پر واجب ہے جو کہ تندرست وتوانا ہوں، کسب وکمائی پر قادر ہو، لیکن تنگدست ہوں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ احناف کے یہاں مفتی بہ قول کے مطابق محض ماں باپ کا محتاج وضرورت ہونا وجوب کفالت کے لیے کافی ہے۔ "فالمعتبر فى ايجاب النفقة نفقة الوالدين مجرد الفقر" (ردالمختار۵/۲۵۵)

مالکیہ کے نزدیک مکمل کفالت اس وقت واجب ہے، جبکہ باپ کمانے پر قادر نہ ہو اور شوافع کے یہاں والدین کی کفالت اولاد پر مطلق واجب ہے ان کے یہاں محتاج وضرورت مند ہونا بھی شرط

نہیں ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیے حاشیہ دسوقی وشرح کبیر ۳/۵۰۱اورالمہذب للنووی)۔

کیا بیٹی پر بھی والدین کا نفقہ واجب ہے؟ والدین کی خدمت وکفالت لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں پر بھی حسبِ استطاعت واجب ہے۔صاحب ہدایہ لکھتے ہیں: وهي على الذكور والاناث بالسوية في ظاهر الرواية وهو الصحيح (ہدایہ۲/۴۴۹) ماں باپ کا نفقہ بیٹے اور بیٹیوں پر برابر واجب ہے یہی ظاہر روایت اور صحیح قول ہے۔

مالکیہ کا مذہب بھی یہی ہے، چنانچہ المجموع میں ہے "فتجب على الولد نفقة الأب والأم" لیکن شوافع اور حنابلہ کے یہاں اس کی صراحت نہیں ملتی ہے۔لیکن امام نوویؒ نے الولد کا لفظ استعمال کیا ہے، اور عربی زبان میں الولد کا اطلاق اولاد پر ہوتا ہے، جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہوتی ہیں، اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ شوافع کے مذہب کے مطابق بھی والدین کی خدمت وکفالت بیٹے اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہوگی۔

بعض فقہاء کرام نے امام ابوحنیفہؒ کی جانب منسوب یہ قول نقل کیا ہے کہ میراث میں استحقاق کے حساب سے لڑکا دو تہائی اور لڑکی ایک تہائی والدین کے اخراجات ادا کریں گے۔البتہ مفتی بہ قول یہی ہے کہ لڑکے اور لڑکی دونوں پر برابر نفقہ واجب ہوگا۔

مشترکہ خاندان میں قریبی رشتہ داروں سے پردہ کا مسئلہ: مشترکہ خاندانی نظام میں ایک بہت بڑا مسئلہ شرعی پردہ کا ہے خاص طور پر جب خاندان بڑا ہو اور سارے افراد ایک مکان اور احاطے میں رہتے ہوں تو بہت احتیاط کے باوجود ایک دوسرے سے مکمل پردہ ممکن نہیں ہو پاتا۔اسی لیے مشترکہ خاندانی نظام ان شرعی مفاسد کی بنا پر مستحسن اور پسندیدہ نہیں ہے۔پردہ جس کی اسلام میں بہت زیادہ تاکید آئی ہے اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے، قرآن کریم میں متعدد مواقع پر اور بطور خاص سورۂ احزاب اور سورہ نور میں اس کا تفصیلی حکم دیا گیا۔اسی طرح ستر سے زیادہ احادیث رسول میں قولاً وعملاً پردہ کے احکام بتلائے گئے ہیں، لہذا بغیر کسی شرعی عذر کے غیر محرم سے پردہ نہ کرنے یا اس میں تساہل برتنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔

شریعت نے کسی کو اس بات کا پابند نہیں بنایا ہے کہ پورا خاندان ایک ساتھ ایک گھر میں رہے۔بلکہ ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے اگر پردہ میں رکاوٹ پیش آرہی ہو تو شوہر پر ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی کے لئے ایسی جگہ رہائش کا انتظام کرے جہاں وہ مکمل پردہ کا اہتمام کر سکے۔

اس مسئلہ میں قریب اور دور کے رشتہ دار میں ہرگز فرق نہیں کیا جائے گا۔بلکہ احادیث کی روشنی میں تو قریبی رشتہ داروں سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔"عن عقبة بن عامرؓ ان رسول الله ﷺ قال: اياكم والدخول على النساء، فقال رجل من الانصار: يا رسول الله افرأيت الحمو قال: الحمو الموت"

عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :عورتوں کے پاس جانے سے پرہیز کرو۔ایک انصاری شخص نے عرض کیا، یارسول اللہ آپ دیور کے بارے میں فرمائیں، آپ نے جواب دیا: دیور تو موت ہے۔(ترمذی ۱/۱۳۹)۔

لفظ ''الحمو'' کی تحقیق کے متعلق علامہ ابن حجرؒ ''فتح الباری'' میں لکھتے ہیں:"اتفق أهل العلم باللغة على أن الأحماء اقارب زوج امرأة كأبيه وأخيه وابن اخيه وابن عمه ونحوهم" (فتح الباری ۲/۲۸۹) علماء لغت اس پر متفق ہیں کہ ''حمو'' کا اطلاق شوہر کے قریبی رشتہ دار مثلاً اس کے والد، بھائی بھتیجے اور چچازاد بھائی وغیرہ پر ہوتا ہے۔

صاحب مرقات نے ''حمو'' کو موت قرار دینے کی وجہ یوں تحریر کی ہے۔"لأن الخوف من الاقارب اكثر والفتنة منهم أوقع لتمكنهم من الوصول إليها والخلوة بها من غير نكير عليهم وعادة الناس المساهلة فيه" قریبی رشتہ داروں سے

خوف اور فتنہ کے وقوع کا امکان زیادہ رہتا ہے، اس لئے کہ وہ بآسانی عورت کے پاس پہنچ سکتے ہیں۔تنہائی کے مواقع بھی زیادہ ہوتے ہیں اس پر نکیر بھی نہیں کی جاتی، بلکہ عموماً لوگ اس حوالے سے تساہل پسندی کا شکار ہیں۔(مرقات شرح مشکوۃ ۳/۴۰۹)۔

پردہ کے بارے میں شریعت کا مزاج اور مذاق یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز فتنہ وموقعۂ تہمت سے اجتناب اور بچنا ہے، اس لئے جہاں فتنہ زیادہ ہوگا، وہاں حرمت وکراہت اتنی ہی شدید ہوگی۔اسی لئے حدیث شریف میں عورت (غیر محرم) سے تنہائی میں ملنے سے منع کیا گیا ہے، حضرت عامر بن ربیعہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ کوئی شخص کسی عورت سے تنہائی میں نہ ملے، فرمایا کہ تیسرا شیطان ہوتا ہے۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خاندان کے غیر محرم لوگوں سے عام اصول کے مطابق پردہ واجب ہے، کسی غیر محرم کے ساتھ تنہائی میں ملنا ہنسی مذاق کرنا غیر ضروری گفتگو کرنا جائز نہیں ہے، ان چیزوں سے اجتناب لازم ہے، البتہ احتیاط کے باوجود اگر سامنا ہوجائے اور ہر طرح کے فتنہ سے بچنے کی کوشش ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مولانا اختر امام عادل لکھتے ہیں: ''مشترک نظام میں جبکہ خاندان کی متعدد اکائیاں ایک احاطے میں قیام پذیر ہوتی ہیں ایک دوسرے کا آمنا سامنا ہونے سے بچنا بہت مشکل ہے، یہ ایک مجبوری ہے جس میں ابتلائے عام ہے، یہ ویسی ہی مجبوری ہے جس کو فقہاء نے حاجتِ داعیہ کہا ہے، اس لئے اگر شہوت سے امن ہو تو بلا ارادہ غیر محرم عورت کے چہرہ پر نظر پڑ جانے میں مضائقہ نہیں، البتہ ارادہ کے ساتھ نہ دیکھے، تنہائی میں اکٹھا ہونے سے ہر ممکن پرہیز کرے، باہر یا اپنے کمرے سے گھر کے احاطے میں داخل ہو تو آواز دیکر یا کھانس کر داخل ہو تاکہ غیر محرم عورتیں محتاط ہوجائیں اور بلا ضرورت کسی پر نظر نہ پڑے، عورتیں بھی جب اپنے کمروں سے نکلیں تو پورے پردہ کے ساتھ نکلیں جس میں صرف ضرورت کے بقدر ہی آنکھ وغیرہ کھلی ہو، ہنسی مذاق اور بے تکلفی سے پوری احتیاط برتیں، دل ونگاہ کو پاک رکھیں اور جان بوجھ کر کسی ایسی جگہ نہ رہیں جہاں تنہائی میں کوئی ان سے ملنے کی کوشش کرے۔اس احتیاط کے ساتھ رہا جائے تو مشترک نظام مشکل ہونے کے باوجود ناجائز نہیں رہے گا۔''

بعض اہل علم عموم بلویٰ کی بناء پر مشترکہ خاندانی نظام میں قریبی رشتہ داروں سے پردہ کے سلسلے میں کچھ نرمی اور سہولت کے قائل ہیں۔

مولانا مفتی انور علی اعظمی مولانا یوسف لدھیانوی مرحوم کے ایک فتویٰ کو نقل کرنے کے بعد اس پر محاکمہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''اجنبی نامحرموں سے چار دیواری کا پردہ ہے اور جو نامحرم رشتہ دار ہوں عورت ان کے سامنے جانے پر مجبور ہو ان سے چادر کا پردہ لازم ہے، اس کی تفصیل حضرت تھانویؒ کی ''تعلیم الطالب'' سے نقل کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ''جو رشتہ دار شرعاً محرم نہیں، مثلاً خالہ زاد، ماموزاد، پھوپھی زاد، بھائی یا بہن یا دیور وغیرہ، جوان عورتوں کو ان کے روبرو آنا اور بے تکلف باتیں کرنا ہرگز نہ چاہیے، جو مکان کی تنگی یا ہر وقت کی آمد ورفت کی وجہ سے گہرا پردہ نہ ہوسکے، تو سر سے پاؤں تک تمام بدن کسی میلی چادر سے ڈھانک کر شرم ولحاظ سے بضرورت روبرو آجائے اور کلائی اور سر کے بال اور پنڈلی ان سب کا ظاہر کرنا حرام ہے، اسی طرح ان لوگوں کے روبرو عطر لگا کر آنا عورت کو جائز نہیں اور نہ بجتا ہوا زیور پہننے'' (تعلیم الطالب آپ کے مسائل اور ان کا حل)۔مولانا مفتی انور علی اعظمی صاحب اس فتویٰ کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت تھانویؒ کی بات بہت اونچی ہے لیکن اس پر عمل دشوار ہے۔ایک گھر میں رہتے ہوئے مکمل پردہ بہت مشکل ہے وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ بچپن سے ایک ساتھ کھیلے ہوں اور آج بھی ایک چار دیواری میں گزارا ہو رہا ہو تو محض اس تصور سے کہ چچازاد بھائی گھر میں آرہا ہے فوراً چادر اوڑھ لینا بہت ہی اونچے تقویٰ کے

ساتھ ممکن ہوسکتا ہے، شریعت میں عمومِ بلویٰ کی بنا پر حکم میں کچھ سہولت دی جاتی ہے، یہاں بھی اسی طرح کی مجبوری ہے، گھر کا کام کاج بھی کرنا ہے، چچازاد بھائیوں کا ہر وقت آنا جانا ہے، اس لئے آمنا سامنا ہوسکتا ہے، اجنبی لڑکے اور لڑکی کا جب آمنا سامنا ہوتا ہے اس وقت کیفیت دوسری ہوتی ہے اور ایک گھر کے لڑکے ولڑکی کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہوتا ہے۔ البتہ ضروری ہے کہ ایک کمرہ میں تنہا نہ رہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا یخلون رجل بامرأۃ منھا بسبیل فإن ثالثھما الشیطان (ترمذی شریف بحوالہ ہدایہ ۴/۴۴۶) کی ہدایت کی ہے، آپس میں بہت بے تکلفی نہ ہو، اور گھر کے بڑے لوگ جوان لڑکے لڑکیوں پر نظر بھی رکھیں، گھر کے ذمہ داروں کی نگرانی اور گھر کی تربیت برائیوں سے دور رکھنے میں بہت موثر رول ادا کرسکتی ہے، اس دور میں ہزاروں دوریوں کے باوجود موبائل ایک دوسرے سے قریب کر دیتا ہے۔ بہت دور رہنے والوں کے لئے بھی ملنا کچھ مشکل نہیں اور چہار دیواری میں رہنے والے بھی بچنا چاہیں تو بچ سکتے ہیں، حقیقت میں برائی کا احساس اور اللہ کا ڈر آدمی کو برائی سے بچاتا ہے'' (مشترکہ وجداگانہ خاندانی نظام ۱۰۷-۱۰۸)۔

مولانا محمد ارشد فاروقی غیر محرم سے پردے کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں: ''اسلام نے مرد وعورت کے مابین نقطۂ اعتدال قائم رکھنے کے لئے پردے وستر کا حکم دیا ہے اور انسدادی تدابیر کے طور پر لباس اور ستر کے احکام، استیذان، تخلیہ وملمس کی ممانعت، محرموں اور غیر محرموں کے درمیان فرق، غض بصر، اظہار زینت کی ممانعت اور اس کے حدود، چہرہ کا حکم، حاجات کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت کے احکام بیان کئے ہیں۔ خاص طور پر ''اظہار زینت'' کا جو مفہوم "إلا ما ظھر منھا" (سورہ نور ۳۱) سے مترشح ہوتا ہے اس کی تعیین میں مفسرین کے دو قول واضح طور پر سامنے آتے ہیں، یہ کہ عورت کے پردے میں چہرہ بھی شامل ہے، دوسرا یہ کہ چہرہ کا پردہ میں شمار نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مفسرین وفقہاء کے ارشادات کے تتبع سے چہرے کی شمولیت کا قول راجح، قابل عمل وتقلید ہے لیکن مجتہد فیہ مسئلہ کی اصولی حیثیت پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے کہ اختلاف رائے وسعت وگنجائش کی کلید لے کر رحمت کے دروازے کھولتا ہے۔ آج وہ مسلم ممالک جہاں کی خواتین پردے کی پابند ہیں ان میں انڈونیشیا اور ملیشیا وغیرہ میں پردہ نام ہے اسکارف کا کہ سر ڈھکا رہتا اور گٹوں سمیت ہاتھ کھلے رہتے ہیں، اس روش کو اگر غیر اسلامی قرار دیں تو مسلم خواتین کی بڑی جماعت کو جو اسلام کی تعلیمات کی پابند ہیں بے پردگی کے گناہ کا مرتکب مانیں جو شریعت کے مزاج سے میل نہیں کھاتا، اس لئے انہیں مفسرین وفقہاء کے دوسرے قول پر کاربند سمجھنا چاہیے، اور ہمارے ملک کی مسلم آبادی کا بہت بڑا حصہ مشترک خاندانی نظام پر مشتمل ہے، اس لئے ایک گھر میں رہنے والی عورتوں، لڑکیوں، خالہ زاد، ماموں زاد بھائیوں سے ہر وقت چہرہ چھپانے، نقاب میں رہنے کا حکم حرج سے خالی نہیں اور نہ کرنے کی صورت میں ان کو گنہگار قرار دینا اور دائمی جرم کرتے رہنے کی بات کرنا قریب قیاس شرعی نہیں۔ قرآن نے (حضرت شعیب علیہ السلام) کی صاحبزادی کا محتاط وباحیا موسیٰ علیہ السلام کے پاس اپنے والد کا پیغام لے کر آنا یوں نقل کیا ہے: "فجائتہ احداھما تمشی علی استحیاء" (پھر آئی اس کے پاس ان دونوں میں سے ایک چلتی تھی شرم سے) یہ ہے شریف اور پاکباز عورتوں کا قاعدہ۔ (مشترکہ وجداگانہ خاندانی نظام صفحہ ۲۰۹-۲۱۱)۔

مولانا محمد ابرار خاں ندوی مشترکہ خاندان میں پردہ کے احکام کے تعلق سے لکھتے ہیں: ''مشترکہ خاندانی نظام شرعی مفاسد کی وجہ سے مستحسن وپسندیدہ نہیں ہے، پردہ جس کی اسلام میں نہایت تاکید آئی ہے، اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے، قرآنِ کریم اور احادیث نبویہ میں جا بجا اس کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ آج زیادہ

تر معاشرت اجتماعی ہے، چچازاد بھائیوں کے بے تکلف گھر میں آنے جانے کی وجہ سے بے پردگی ہوتی ہے۔ دوسری طرف عورتوں کا گھر کے اندر مکمل پردہ کے ساتھ رہنا اور پردہ ہی میں خانگی امور انجام دینا مشقت و پریشانی کا باعث ہے۔ اسی تنگی وحرج، دقت وپریشانی کے سبب شریعت نے محرم رشتہ داروں کے لئے عورت کے سر، گردن، چہرہ، کان، بازو، پنڈلی وغیرہ پر پڑنے والی نگاہ کو ناجائز وممنوع قرار نہیں دیا ہے۔ علامہ داماد آفندی نقل فرماتے ہیں: "فیحل النظر للمحارم إلی تلك الأعضاء؛ لأن المرأة تکون فی بیتها فی ثیاب مهنتها عادة ولا تکون مستترة، ویدخل علیهن بعض المحارم من غیر استیذان فلو حرم النظر إلی هذه المواضع یودی إلی الحرج، " (مجمع الانھار ۲/۵۹۲)۔

لیکن غیر محرم کے لئے ان اعضاء کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہے، لڑکیاں گھر سے الگ جداگانہ زندگی تو نہیں گزار سکتی ہیں اور نہ ہی "المشقة تجلب التیسیر" اور "إذا ضاق الأمر اتسع" جیسے قواعد کا سہارا لے کر عورتوں کو کھلی چھوٹ دی جاسکتی ہے کہ وہ جیسے چاہیں گھر کے اندر رہیں، اور غیر محرم مردوں کو بھی اس کی قطعاً اجازت نہیں کہ بلا اجازت گھر میں جب چاہیں داخل ہوتے رہیں، تو ایسی صورت حال میں دونوں کو چاہیے کہ غایت درجہ احتیاط کریں، اس کے بعد اگر کچھ بے حجابی ہوجاتی ہے تو اللہ کی ذات سے امید قوی ہے کہ مواخذہ وگرفت نہ ہوگی" (مشترکہ وجداگانہ خاندانی نظام ۲۳۲-۲۳۳)۔

اولاد پر والدین کی ذمہ داریاں: والدین کے لئے اولاد کی ذمہ داریوں کو فقہاء نے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فقہ وفتاویٰ کی کتابیں ان تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔ مولانا اختر امام عادل (فاضل دیوبند) نے ان تفصیلات کا خلاصہ اپنے ایک مضمون "مشترکہ خاندانی نظام۔ شرعی نقطۂ نظر سے" میں پیش کیا ہے، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

کیا بہو پر ساس اور سسر کی خدمت واجب ہے؟ عورت پر شوہر کے والدین کی خدمت اس وقت دیانۃً واجب اور ضروری ہے جب کہ والدین کی خدمت کرنے والا کوئی اور میسر نہ ہو، لیکن اخلاق اور مروت کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر دوسرا خدمت کرنے والا میسر ہو تب بھی عورت کو چاہیے کہ اپنی ساس اور سسر کی خدمت سے دامن نہ کھینچے، یہ اس کا اپنے شوہر کے ساتھ تعاون بھی ہے، یہاں یہ بات یاد رہے کہ اصل میں والدین کی خدمت اس کے شوہر پر ہی واجب ہے، اور شوہر اپنی بیوی اور اس کے بچوں کی ضروریات میں مشغول ہے، اس لئے مروت ودیانت کا تقاضا ہے کہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنے شوہر کے لئے معین ومددگار رہے۔

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب لاج پوریؒ اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''شوہر کی والدہ اور اس کے بھائی بہن کے لئے کھانے کا انتظام کرنا عورت پر شرعاً لازم وضروری نہیں ہے، البتہ اگر عورت اپنی ساس کی ضعیفی اور کمزوری کی وجہ سے ان کی خدمت کرے اور ان کے لئے کھانا پکائے تو یہ اس کے لئے سعادت مندی ہوگی اور یہ خدمت انشاء اللہ اس کے لئے باعثِ اجر وثواب ہوگی''۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۸/ ۴۵۷)۔

الغرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ قانونی طور پر بہو پر ساس اور سسر کی خدمت ضروری اور واجب نہیں ہے، لیکن اگر بہو کے علاوہ کوئی دوسری قریبی عورت خدمت کرنے والی نہ ہو، نیز ماں مجبور ہو خود سے وہ کام انجام دینے کے لائق نہ ہو، تو ایسی صورت میں بہو پر ساس کی خدمت واجب ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

□ فکر اسلامی

(قسط-۱۰)

مفکر اسلام - ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

عالم اسلام کی صورت حال

مولاناؒ نے نومبر ۱۹۸۳ء میں کویت میں ایک تقریر کی اسمیں عالم اسلام کا جو نقشہ کھینچا اور جو صحیح صورت حال پیش کی آج بھی من وعن وہی مسئلہ ہے بلکہ اسمیں سینکڑوں فیصدی اضافہ ہوا ہے اور جب تک اس صورت حال کو تبدیل نہ کیا گیا کوئی امید نہیں کہ ملت اسلامیہ کا مستقبل بدل سکے:

''اس میں میں نے موجودہ عالم اسلام کا واقعی اور حقیقی نقشہ پوری صفائی کے ساتھ سامنے رکھا اور اسکی موجودہ صورتِ حال، اس کی سیاسی بے وزنی وجمیت اسلامی کی کمی، خود اس کے جسم کے بعض حصوں (مسلمانوں اور عربوں) پر ٹوٹنے والے مصائب کے بارے میں اس کی بے حسی، مسلم ممالک اور مسلمان حکومتوں کے شہروں کی پر عشرت اور آلودۂ غفلت زندگی، مسلمانوں میں نقصان نہ پہونچانے کی صلاحیت کا فقدان جس سے بڑی قومیں اور حکومتیں ڈریں جذبۂ جہاد اور شوق شہادت کا فقدان جو مسلمانوں کی طاقت کا بڑا سرچشمہ تھا، اور صاحبِ اقتدار طبقہ اور اہلِ حکومت اور مسلم عوام کی وہ محاذ آرائی جس نے حاکم طبقہ کی ساری توانائیوں کو مسلم عوام کے شعلۂ ایمان کے سرد اور ان کو بے حس بنانے پر مرکوز کر دیا ہے، اور بیرونی دشمنوں سے ان کی توجہ مستقل طور پر ہٹادی ہے، نیز اہل قلوب اور اس حقانی وربانی طبقہ کا فقدان جس نے ہمیشہ یخ بستہ مسلم معاشرہ کے ایمان میں گرمی، دلوں میں نرمی، اور آنکھوں میں نمی پیدا کی اور اس کو دولت وعشرت کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہنے سے بچایا اور فکرِ آخرت کو زندہ رکھا، یہ وہ سب اسباب ہیں جن کی وجہ سے بعض لوگ کہنے لگے ہیں کہ عالم اسلام فن عروض کی بحر کی طرح ہے کہ نام اس کا ''بحر'' ہے مگر پانی کا ایک قطرہ نہیں'' (کاروان زندگی ج ۲ ص ۳۸۷)

ہر وقت تگ و دو اور تیاری کا سبق

یمن کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے جہاں خطرات سے آگاہ کیا اور اخلاقی گراوٹوں کا ذکر کیا اور سہولت پسندیوں کے خطرات سے ڈرایا وہیں اقبال کے اس پر از حکمت شعر بلکہ تقدیر امم کے ضامن اصول ''شمشیر وسناں اول اور طاؤس ورباب آخر'' کی بھی تشریح کی، مولانا کی اس تقریر کی روشنی میں بلکہ اسکو معیار بنا کر عرب حکومتوں بلکہ عالم اسلام کے تخلف میں ان کے کردار کو پرکھا جا سکتا ہے:

''شام کو شہر کی جامع مسجد جامع المظفر میں بعد مغرب تقریر ہوئی جس میں علماء اور معززین شہر کی بڑی تعداد شریک تھی، مسلم ممالک اور معاشروں کے عام حالات اور یمن کے خصوصی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے (جس کے سر پر جنوبی یمن کی کمیونسٹ حکومت کے غلبہ اور کمیونزم کے اثر کا خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے) میں نے تقریر کا موضوع اور اس کا مرکزی نقطہ فاتح مصر سیدنا عمرو بن العاصؓ کے اس تاریخی جملہ کو بنایا جس سے انہوں نے عرب فاتح فوج اور مسلمانوں کو مخاطب کیا تھا، انہوں نے فرمایا تھا "إنكم في رباط دائم، لكثرة الأعداء حولكم وتشوّف قلوبهم إليكم" (تم اپنے کو مستقل محاذ جنگ پر سمجھو، اس لئے کہ تمہارے چاروں طرف کثرت سے دشمن پھیلے ہوئے ہیں، اور ان کی نیتیں اور نگاہیں ہر وقت تمہارے اوپر ہیں) میں نے اس کی تشریح کرتے

ہوئے دائمی طور پر بیدار اور تیار اور خطرات و امکانات سے خبردار رہنے کی ضرورت بیان کی، اسی کے ساتھ تن آسانی اور سہولت پسندی کی زندگی اور اخلاقی گراوٹ اور اجتماعی امراض سے بھی آگاہی دی، اور علامہ اقبال کے ایک شعر کی عربی میں تشریح کی ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

پھر میں نے ہندوستان کی مغل حکومت کے آغاز و انجام کو پیش کیا کہ وہ بابر کی جفاکشی، شہ سواری، اور کشور کشائی سے شروع ہوئی تھی، اور محمد شاہ رنگیلے اور اس کے جانشینوں کی عیش پسندی اور رنگ رلیوں پر ختم ہوئی، پھر قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھ کر اس کی تشریح اور واقعات سے اس کی تائید بیان کی:

واذا اردنا أن نهلك قرية امرنا متر فيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرنها تدميرا۔ (سورہ بنی اسرائیل)

ترجمہ: جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں، تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہوجاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ (کاروان زندگی ج ۳ ص ۴۹-۵۰)

جرأت مندانہ صراحت

ایک داعی کو حکمت کے ساتھ جرأت مومنانہ اور قرآنی صراحت سے سرشار ہونا چاہیے، مولانا کی ذات میں یہ پہلو بدرجہ اتم موجود تھا، بنگلہ دیش کا ماضی و حال ذہن میں رکھتے ہوئے اس اقتباس کی گھن گرج اور صراحت و جوش ایمانی ملاحظہ کیجئے:

''۱۶/ مارچ ۱۹۸۴ء کو جمعہ کا دن تھا، نماز ڈھاکہ کی مرکزی جامع مسجد بیت المکرّم میں پڑھنی تھی، اور امامت بھی کرنی تھی، یہاں بنگلہ دیش کے صدر جنرل ارشاد بھی نماز پڑھنے کے لئے آنے والے تھے، جمعہ کے خطبہ سے پہلے میں نے تقریر کی جس میں صفائی کے ساتھ کہا کہ اس ملک کی قسمت اسلام سے وابستہ ہے، میں نے کہا کہ پرانے روؤسا اور والیانِ سلطنت کسی کو کوئی جاگیر دیا کرتے تھے، اور وہ اس کو (Allot) ہوجاتی تھی، اگر کوئی اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا تھا تو والی ریاست یا حکومت سے جنگ سمجھی جاتی تھی، آپ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ سرزمین (بنگلہ دیش) اسلام اور اللہ کے آخری رسول محمد ﷺ کے نام الاٹ (Allot) ہوچکی ہے، اب اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش کرنا اور اس ملک و علاقہ کو کسی اور کے اختیار میں دینا، اور کسی اور کا جھنڈا اس پر نصب کرنا اس فیصلہ خداوندی کے خلاف بغاوت سمجھی جائے گی، اس ملک کے لئے تقدیر الٰہی اور قضاوقدر کا فیصلہ ہے کہ یہ ملک مسلمان رہے، اور اس ملک کی خیریت و سلامتی بھی اسی میں ہے، میں اس منبر پر محراب میں بیٹھ کر مسجد میں آپ سے کہتا ہوں کہ یہ ملک کبھی خوشحال نہیں ہوسکتا، اور اس ملک کی چول کبھی بیٹھ نہیں سکتی، اگر اسلام کو اس نے چھوڑا، کوئی پروجیکٹ (Project) کوئی پلان (Plan) کوئی باہر کی مدد (Aid) اندر باہر کی سیکوریٹی اس ملک کو بچا نہیں سکتی، سمجھنے والے اس بات کو سمجھ لیں اور لکھنے والے اس بات کو لکھ لیں، پھر میں نے آئندہ نسلوں کو اسلام کو اور اس کی تعلیمات سے وابستہ رہنے اور خود مکمل اسلامی زندگی اختیار کرنے کے سلسلہ میں مشورے دیئے اور اس پر زور دیا کہ یہ دینی اعتقادی، ایمانی، وعملی تسلسل اس ملک میں باقی رہنا چاہیے۔ (کاروان زندگی ج ۳ ص ۶۰-۶۱)

احساس ذمہ داری

مولانا کو اللہ تعالی نے جو تڑپ اور احساس دیا تھا کہ وہ وقت سے پہلے ہی خطرے کو بھانپتے تھے اور اس کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے تھے، اپنی ذمہ داری کا احساس کس قدر بڑھا ہوا تھا اس کا اندازہ کیجئے:

''ناچیز مصنف کو اللہ تعالیٰ نے اس مخصوص ماحول کی برکت سے جس میں اس کا ذہنی و علمی نشو ونما ہوا، نیز قرآن کے تدبر اور تاریخ کے مطالعہ سے اتنی عقل عام (Common Sense) اور حقیقت پسندی عطا فرمائی تھی کہ اپنے سارے علمی و ادبی ذوق، مطالعہ کے انہماک، اندرونی و بیرونی دعوتی سرگرمیوں، مشرق وسطی اور بلاد عرب کے حالات و مسائل سے گہری دلچسپی اور وابستگی کے

ساتھ اس نے یہ سمجھ لیا کہ اگر ہندوستان میں اس ہندو احیائیت وجارحیت اور ملت کو درپیش خطرات سے صرفِ نظر کیا گیا تو خاکم بدہن اس ملک کے اسپین دوم بن جانے کا خطرہ ہے، جس کا عرصہ سے ہندو احیائیت پسند عناصر خواب دیکھ رہے ہیں'' (کاروان زندگی ج ۳ ص ۸۲)

صاف صاف باتیں

حضرت مولانا کو ہر موقع پر امت کا احساس رہتا تھا اور اپنا فرض متحضر رہتا تھا جس کے سبب وہ کبھی بھی ضرورت کے مطابق بات کہنے سے نہ چوکتے تھے بلکہ موقع کی تلاش میں رہتے تھے، عام طور سے جب کسی کو کوئی استقبالیہ دیا جاتا ہے تو بالخصوص ہمارے اس دور میں وہ پھر اس کے گن گاتا ہے اور مدح وتوصیف میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتا ہے، لیکن حضرت مولانا کو اعیان مکہ وجدہ نے استقبالیہ دیا اسمیں مولانا نے شکریہ کے چند الفاظ کہنے کے بعد جو کہا اس کے اقتباس دیکھیے:

''دنیا میں وزن واعتبار کے دو پیمانے ہیں، ایک قامت، دوسرے قیمت، لیکن اللہ تعالیٰ نے قامت پر قیمت کو ترجیح عطا فرمائی ہے،

والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض، الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر، ترجمہ: اور جو لوگ کافر ہیں وہ باہم ایک دوسرے کے وارث ہیں، اگر یہ نہ کروگے تو زمین میں (بڑا) فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔ (کاروان زندگی ج ۳ ص ۹۹)

امت اسلامیہ کی قیمت واہمیت ان خصوصیات وصفات کی بنیاد پر ہے جن سے اللہ تعالی نے اسکو نوازا ہے، اسکے یہاں تعداد اور ساز وسامان کی کثرت کا اعتبار نہیں، اور نہ اسکی مکانی مسافت کے طول وعرض کا جس پر اسکی حکومت کا سکہ چلتا ہے، اور نہ اس زمانی مسافت کے طول وامتداد کا جس پر اسنے اپنے اثرات چھوڑے ہیں، میں مسلمانوں کی اس جماعت کو خواہ وہ کتنی ہی کم تعداد میں ہو اس پیمانے سے ناپتا ہوں میں اسکو اسلام کی اس خرد بین سے دیکھتا ہوں، جو خدا کی عطا کردہ ہے۔'' (کاروان زندگی ج ۳ ص ۱۰۲۔۱۰۳)

مؤثر حکمت کے لئے عرفان ذات کا تذکرہ

شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں جب راجیو گاندھی بل پیش کرنے کی تیاری کر رہے تھے تبھی مولانا کو اطلاع ملی کہ راجیو سے کہا جا رہا ہے کہ بل پیش کرنے سے قبل بعض مسلم ممالک سے معلوم کر لینا چاہیے کہ وہاں عائلی قوانین میں کچھ ترمیم ہوئی ہے یا نہیں، اگر ہوئی ہے تو پھر یہاں کوئی مسئلہ ہی نہیں، مولانا کو احساس ہو گیا کہ اگر ایسا ہوا تو معاملہ اچھا نہیں ہوگا، اس دوران راجیو نے ملاقات کے لئے بلایا، مولانا نے مدعا کو مؤثر انداز میں پیش کرنے اور مسئلہ پر حاوی ہونے کے لئے جو انداز اپنایا وہ ملاحظہ کیجئے:

''میرے ذہن میں خدا نے ایک بات ڈالی اور وہ تیر اپنے نشانے پر بیٹھا، ہم لوگ جب جمع ہوئے تو وہ میرے سامنے ہی بیٹھے تھے، میں نے کہا کہ راجیو جی! اگر آپ سے کوئی کہے کہ دوسرے مسلم ممالک بھی تو ہیں وہاں سے معلوم کرنا چاہیے کہ انہوں نے اپنے عائلی قانون (Personal Law) میں کوئی ترمیم کی ہے یا نہیں ؟ پھر آپ انکی تقلید کر سکتے ہیں، تو آپکو یہ پوزیشن ہرگز قبول نہیں کرنا چاہئے، ہم ایک مرتبہ اگر انکار کریں تو آپ کو چار مرتبہ انکار کرنا چاہیے، اس لئے کہ جہاں تک ہندوستان کی رہنمائی کرنے کا تعلق ہے، آپ کی یہ تیسری پشت ہے، ہندوستان علمی ومذہبی حیثیت سے (جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے) کسی مسلم یا عرب ملک سے کم نہیں ہے، وہ اپنا خود مقام رکھتا ہے، مجھے کہنا نہیں چاہیے، لیکن کہتا ہوں کہ عالم اسلام کی سب سے بڑی ماہرین قانون شریعتِ اسلامی کی مجلس (اکیڈمی) رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظّمہ "المجمع الفقھی" ہے، جس کا ہندوستان سے میں تنہا ممبر ہوں، بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ سارے ممبران ایک طرف تھے، میں ایک طرف تھا، اور فیصلہ میری رائے پر ہوا، یہاں اسی مجلس میں ایسے علماء موجود ہیں کہ اگر ان کا نام جامع ازہر مصر میں لیا جائے تو لوگ احترام سے گردن جھکا لیں، یہ بات جو نفسیاتی اثر رکھتی تھی اپنا اثر کر گئی اور راجیو جی نے پھر دوسرے ممالک کا حوالہ نہیں دیا'' (کاروان زندگی ج ۳ ص ۱۳۴)

☆☆☆

.....جاری

❑ اصلاح معاشرہ

اشیاء میں ملاوٹ، ایک بڑا جرم اور اخلاقی گراوٹ

مفتی رحمت اللہ ندوی
(دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

ایک وہ دور تھا، جب تقوی دین اور خوفِ خدا پورے معاشرے پر اس قدر غالب تھا کہ ایک عام آدمی حتی کہ چرواہے تک کو ہر وقت اس کا استحضار رہتا تھا کہ ''اللہ ہم کو دیکھ رہا ہے'' ہم خدا کے کیمرے کی نظر میں ہیں، اور آج معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، اس دور سعید میں ایک معمولی شخص کے دل میں جو تقوی تھا، آج شاید کسی بڑے سے بڑے خانقاہی پیر و مرشد میں بھی نہ ہو۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کا زمانہ خلافت ہے، امیر المومنین کی طرف سے اعلان ہو چکا ہے کہ کوئی دودھ میں پانی نہ ملائے، رات کی تاریکی اور سناٹا ہے، خلیفۂ وقت رعایا کی خبر گیری کے لئے مصروفِ گشت ہے، ایک گھر سے ماں بیٹی کی گفتگو کی آواز کانوں میں پڑتی ہے، حضرت عمرٹھہر جاتے ہیں، اماں جان! کیا آپ نے امیر المومنین کا اعلان نہیں سنا؟ ماں کہتی ہے: رات کا وقت ہے، امیر المومنین کو کیا خبر؟ بیٹی جواب دیتی ہے: امی جان! اگر امیر المومنین کو خبر نہیں، مگر اللہ کو تو خبر ہے، اگر خلیفۂ وقت کی ہم پر نظر نہیں، تو کیا ہوا، اللہ کی نگاہ تو ہم پر ہے۔

یہاں ذرا ٹھہریئے، اپنے گریباں میں جھانکئے، گردوپیش کا جائزہ لیجئے، اور اہل زمانہ پر نظر ڈالئے، پھر جواب دیجئے کہ کیا آج دودھ میں پانی نہیں بلکہ پانی میں دودھ ملایا جاتا ہے؟ دودھ میں پانی ہی نہیں گندے پانی کے ساتھ ایسی چیزوں کی ملاوٹ نہیں کی جاتی، جسے لیکٹومیٹر (Lactometer) بھی اصلی اور نقلی کا فرق نہ پکڑ سکے؟ کیا ایسی چکنائی کی آمیزش نہیں کی جاتی کہ اگر گھی بنایا جائے تو مقدار ٹھیک ہو لیکن گھی کے بجائے چربی یا بناسپتی تیل ہو؟ اسی طرح کیا دودھ میں یوریا کی ملاوٹ رنگ اچھا رکھنے اور دودھ کو پھٹنے سے بچانے کے لئے نہیں کی جاتی، جو کہ زہر ہے اور صحت کے لئے انتہائی مضر ہے؟

ملاوٹ کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم وہ ہے جس کا براہ راست تعلق انسانی ماحول اور زندگی سے نہیں بلکہ سماجی اور اقتصادی زندگی سے ہے، اس سے کام اور دام پر بہت فرق پڑتا ہے، مثلاً: سونے چاندی، دیگر معدنیات، پٹرول اور ڈیزل، لوبان اور عطریات میں ملاوٹ، یا ساگون، شیشم، اور ساکھر کی لکڑیوں میں ملاوٹ، کہ اچھی طرح پالش کر دی جاتی ہے اور ہو بہو اصلی کی طرح دکھنے لگتی ہے، اور خریدار دیکھ کر دھوکہ کھا جاتا ہے، اکثر لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ واقعی ملاوٹ ہوئی ہے یا نہیں، سندل کی لکڑی کو، جس کی قیمت فی کیوبک فٹ بیس ہزار روپے سے لگ بھگ یا اس سے زیادہ ہے، اس کی جگہ پر صرف اس کی خوشبو ملا کر کسی بھی ہلکی لکڑی کو انجان آدمی

کے ہاتھ فروخت کیا جاسکتا ہے۔

دوسری قسم کی ملاوٹ کا اثر براہ راست انسانی زندگی اور صحت نیز ماحول پر پڑتا ہے، جیسے اشیاء خورد ونوش اور غذائی اجناس میں ملاوٹ، اس ملاوٹ کی بھی دو شکلیں ہیں ایک شکل تو یہ ہے کہ ایسی چیز ملا دی جائے جس سے ذائقہ کم ہوجائے اور افادیت گھٹ جائے، اس صورت میں بلا وجہ انسان کو زیادہ قیمت دے کر، کم دام والی چیز حاصل ہوئی لیکن صحت کو کوئی نقصان نہیں پہونچا، جیسے دودھ میں خالص پانی ملا دینا، یا سگریٹ، بیڑی اور پان مسالے میں تمباکو کی جگہ بھوسہ، اور ڈلی کی جگہ کوئی دوسری غیر نقصان دہ سخت چیز ڈال دینا، اگر چہ صحت پر منفی اثر نہ کرے جبکہ ایسا ممکن نہیں، پھر بھی یہ ایک غلط اور بے ایمانی کا کام ہے، اگر دودھ والا، دودھ میں صاف پانی ملاتا ہے تو اس کا جرم یہ ہے کہ اس نے کم شئی دے کر، زیادہ دام لئے، فائدہ کم ہوا، یا کم از کم کوئی نقصان نہیں ہوا، ماہر حسن کا کہنا ہے: ''ملک میں اشیاء حسن و جمال میں پچاس فیصد نقلی ہیں''۔

دوسری شکل ملاوٹ کی وہ ہے، جس سے صحت کو نقصان پہونچتا ہے، مذہبی خیال مجروح ہوتا ہے، مثلاً نقلی دواؤں کا نقصان اور ان کی وجہ سے اصلی دوا کی شرح فروخت کا گھٹ جانا، شہد، دودھ اور گھی وغیرہ کے بارے میں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اصلی ملتا نہیں تو اسی دام میں نقلی لینے سے کیا فائدہ؟ ملاوٹ کا بازار گرم اور رواج عام ہے، ہر طرف اور ہر ریاست میں اس کا بول بالا ہے، مگر اعداد وشمار کے مطابق سب سے زیادہ گجرات، مہاراشٹر، پنجاب، آندھرا پردیش اور یوپی میں ہے، اگر پکڑے بھی جاتے ہیں تو چھوڑ دئے جاتے ہیں، ۱۳؍جنوری ۲۰۱۱ء کے ہندستان ٹائمز نے یہ خبر شائع کی تھی کہ گجرات میں ملاوٹ کے ۱۶۴۲؍معاملات میں سے ۱۳۵۶؍چھوٹ گئے اور ملزم کو بری کر دیا گیا۔ اس طرح جب کلین چٹ ملتی رہے گی تو کیا انسدادِ جرم ہوگا!!

کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کو انسانی زندگی کے ساتھ کھلواڑ گردانتے ہوئے چین اور روس نے اس جرم کی سنگینی دیکھتے ہوئے سزائے موت کا قانون بنا رکھا ہے۔ یہ سزا نافذ بھی ہوتی ہے یا کچھ تخفیف کر کے عمر قید میں تبدیل کر دی جاتی ہے۔ یہ تو اہل انصاف فیصلہ کریں گے کہ اس جرم کی سزا کیا ہو، لیکن ماحولیات کی رو سے یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی مناسب قدم نہ اٹھایا گیا تو نتیجہ بد سے بدتر ہوجائے گا، بہت دیر ہوجائے گی اور وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔

ماکولات ومشروبات، غذائی اجناس، پھل پھول، سبزی اور تمام چیزوں میں ملاوٹ ہے، آدمی کیا کرے، چاہے کھا کر مرے یا بغیر کھائے مرے، یا مر کر کھائے، گھی، دہی، پنیر، مکھن میں چربی، یوریا اور وناسپتی تیل وغیرہ کی ملاوٹ، بادام کا تیل نکال کر فروخت کرنا، چائے پتی میں برادہ ملا دینا، ہلدی میں پرانی اینٹوں کا پیلا پن ملا دینا، کالی یا گول مرچ میں پپیتے کے بیجوں کی ملاوٹ، دوسرے مسالوں میں اسی سے ملتی جلتی چیزوں کی ملاوٹ، سگریٹ بیڑی، پان تمباکو میں مہلک اجزاء کی ملاوٹ، جس سے بری عادت کبھی چھوٹ ہی نہ سکے، ارہر کی دال میں کھیری دال کی ملاوٹ، جو کینسر جیسی مہلک بیماری کا سبب بنتی ہے، سیب پر کلر کر دینا، انار میں انجکشن دے کر اس کے دانوں کو سرخ کرنا، سبزی کو انجکشن دے کر قبل از وقت تیار کر دینا اور قابل استعمال بنا دینا، مٹر کو پینٹ کر دینا، جوس کے ڈبہ میں اسینس (Essence) ملا دینا، آٹا، چاول دال وغیرہ کی کیا بات کی جائے، منرل پانی کی بوتل میں عام پانی بھر دینا، بیکری والوں کا گھی اور تیل کی جگہ چربی ملا دینا اور نان ویجیٹرین (Non Vegetarian) لکھ دینا، تیل میں چربی، حتی کہ چوری چھپے مردہ جانوروں کی چربی ملا دینا، آئس کریم، پرفیوم، ٹوتھ پیسٹ

میں سور کی چربی باہری ملکوں میں ملائی جاتی ہے اور اپنے کاغذات پر اسے درج کر کے اعلان بھی کیا جاتا ہے۔ دوا کی ایک کمپنی پر الزام تھا کہ وہ ہڈیاں ملاتی ہے اور اپنے کاغذ پر شو نہیں کرتی، یہ بھی ہو رہا ہے کہ جانوروں کا پیشاب بھی دواؤں میں ملا دیا جاتا ہے اور روح کو مجروح کیا جاتا ہے۔

یہ سب کیوں کیا جاتا ہے؟ دولت اور خود غرضی کی وجہ سے، دولت کی حرص و ہوس اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ صرف بٹورنے اور جمع کرنے کی فکر ہے اور اسی کا چسکا لگا ہوا ہے، گن گن کر، سینت سینت کر، اینٹھ اینٹھ کر، تہہ بہ تہہ رکھتا چلا جاتا ہے، نہ خود کھاتا ہے اور نہ دوسروں کو کھانے دیتا ہے، حریص و بخیل اتنا ہے کہ منہ سے نوالے نکلوا لیتا ہے، لقمہ چھین لیتا ہے، بیوہ کا دوپٹہ اتار لیتا ہے، اور یتیم و نادار، بے کس و بے بس کی جیب و تجوری پر دست شفقت پھیر دیتا ہے، تو کہیں کسی غریب کا چولہا بجھانے کے لئے دست دراز کرتا ہے۔ حب مال اور جمعِ سیم و زر کا شوق اس قدر سخت ہے کہ قرآن نے خود منظر کشی کر دی ہے، "وإنه لحب الخير لشديد" کہ انسان کی مال سے محبت بہت سخت ہے، ایک جگہ فرمایا: "تحبون المال حبا جما" (اور تم تو مال سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہو) اس محبتِ مال پر حضرت انسان خود گواہ ہے، "إنه على ذلك لشهيد" یہ حرص و محبت، اور بخل و قساوت اسے یا تو قبرستان پہونچا کر رہے گی یا پھر شمشان لے جا کر دم لے گی، اور زندگی کی ساری کمائی رکھی کی رکھی اور پوری پونجی دھری کی دھری رہ جائے گی۔ ع

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارہ

اشیاء خوردنی میں ملاوٹ کا راز یہی حب مال اور کثرتِ دولت بلکہ تکاثر (کثرت میں مقابلہ آرائی) ہے، کہ انسان سوچتا ہے مجھے ملے مال، دنیا جائے چولہے بھاڑ میں، اس سے آپ انسان کی خود غرضی کا اندازہ لگا سکتے ہیں، اور یہ بھی جان سکتے ہیں کہ وہ کس خود کشی کے راستہ پر جا رہا ہے اور پوری دنیا کس اخلاقی، ایمانی، روحانی بلکہ انسانی زوال کے کگار پر کھڑی ہے، اور انسانیت سے کوسوں دور جا پڑی ہے، اے کاش! اس کا ضمیر جاگتا، احساس زندہ ہوتا، اور شعور بیدار ہوتا!!

حضور اکرم ﷺ ایک بار بازار میں گشت لگا رہے تھے، غلہ کے ایک ڈھیر سے گزر ہوا، اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا تو اوپر کا غلہ سوکھا اور نیچے کا بھیگا تھا، تاجر سے ماجرا پوچھا، اس نے جواب دیا کہ بارش کی وجہ سے غلہ بھیگ گیا تھا میں نے اوپر سے کچھ سوکھا اناج ڈال دیا، فرمایا: یہ دھوکہ ہے، اور جو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (ترمذی)۔

اسلام ملاوٹ کی سخت مذمت کرتا ہے، جھوٹ بولنا، ناپ تول میں کمی کرنا، دھوکہ دینا، گراں فروشی کرنا، یا ضرورت کے ایام میں ذخیرہ اندوزی کرنا، کسی کی مجبوری یا لاعلمی کا فائدہ اٹھا کر سستا خریدنا اور اس کا استحصال کرنا، یہ اور اس طرح کی تمام ایسی باتیں ممنوع ہیں جو شرافت کے درجہ اور انسانیت کے معیار سے گری ہوئی ہوں، معاملات اور اخلاقیات کو بدقسمتی سے ہمارے مسلمانوں کی اکثریت دین کا حصہ سمجھتی ہی نہیں حتی کہ بڑے بڑے دیندار، انتہائی متقی اور پرہیزگار، اور صوم وصلاۃ کے پابند کے پابند لوگ بھی کورے نظر آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ خیر القرون کی باد بہاری ایک بار پھر چلا دے کہ گلشنِ دہر اور چمن کائنات اس کی دلنواز لہر اور اشکبار جھونکے سے پھر دوبارہ معطر ہو جائے، اور عہد نبوی اور عہد صحابہ و تابعین کی یاد تازہ ہو جائے۔

☆☆☆

❑ صحافت

آزادی کے بعد اردو صحافت

مولانا محمد علاء الدین ندوی
(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

اردو صحافت نے ہمیشہ سے مثبت بلکہ قائدانہ کردار ادا کیا ہے، یہ ہمیشہ کسی مشن کی علمبردار اور ہر دور میں احتجاج کی آواز بنی رہی، جب ۱۸۱۰ء میں مولوی اکرام علی کے 'اردو اخبار' اور مارچ ۱۹۲۲ء کو ہفت روزہ 'جام جہاں نما' کلکتہ سے صحافت کا آغاز ہوا تو ملک کی آزادی انگڑائیاں لینے لگی تھی، پھر ۱۹۴۷ء تک اخبارات نکالنے کا مقصد ہی ملک کی آزادی میں شریک ہونا ہوتا تھا۔

اردو ایک زندہ، توانا اور حیات و کائنات کی ترجمانی کرنے والی طاقت ور زبان ہے، اس لیے وہ ہمیشہ ہی سے کسی مشن کی علمبردار اور کسی احتجاج کی آواز بنی رہی۔ اس حقیقت سے کون انکار کرے گا کہ اردو صحافت انگریزوں کے مقابلے میں انقلاب آفریں کارناموں کی سپاہ بن کر قیادت کرتی رہی، وہ ہمیشہ سے سماجی اخلاقیات اور سیاسی معاملات سے وابستہ رہی، آزادی کی لڑائی کی جد و جہد کے پورے عرصے میں یہ سوچ عام ہوگئی تھی کہ جب مقابلے میں توپ آجائے تو اخبار نکالو، انقلاب زندہ باد کا نعرہ اردو کے بطن سے پھوٹا تھا، اردو صحافت نے اس کو جواں مرد، بہادر اور طاقت ور بنایا۔ طوق غلامی کو توڑنے کے لیے جس مرد مجاہد نے بے باکانہ اور سرفروشانہ انداز اپنایا اور آزادی کی خاطر ہر قسم کی قربانی کی ترغیب دیتا رہا وہ 'اردو اخبار' کے نام سے اردو ہی کا اخبار اور اس کا اڈیٹر اور 'آب حیات' کا مصنف مولانا محمد حسین آزاد تھا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ختم ہو جانے کے بعد صوبۂ سرحد کے انگریز گورنر نے لکھا تھا: 'اگر ہمارے حکام صرف اردو اخباروں خصوصاً مسلم اخباروں پر گہری نظر رکھتے، تو اس غدر کو پہلے ہی روکا جا سکتا تھا' (دستاویز راشٹریہ سہارا ۲۵ ستمبر ۱۵ء)۔

اردو صحافت کو اپنے دو سو سالہ تاریخ کے لمبے سفر میں بڑی بڑی صعوبتوں اور نشیب و فراز سے گزرنا پڑا، تاہم اس کا سفر ہمیشہ جاری رہا اور اب تو نئے عہد میں جدید ترین ٹکنیکی وسائل و آلات کی وجہ سے کامرانیوں سے مالا مال ہو رہی ہے۔ اہل فکر و تحقیق اس دو سو سالہ تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

پہلا دور: ۱۸۱۰ء-۱۸۵۷ء تک کے عرصے میں صحافت کی نمود اور اٹھان بڑی زوردار ہوئی اور آزادی کی خاطر دشمن سے برسر پیکار ہو جانے کا امنڈتا ہوا جذبہ بڑا قابل رشک اور ہمت افزا رہا۔ دہلی سے ۱۴، آگرہ سے ۱۸، کلکتہ اور بنارس سے ۱۰-۱۰، مدراس سے ۱۶ پھر بمبئی، بدایوں، الہ آباد، لکھنؤ اور پٹنہ سے کئی کئی اخبارات شائع ہوتے رہے۔

دوسرا دور: ۱۸۵۷-۱۹۰۰ء تک، اس دور میں بھی متعدد اخبارات شائع ہوئے، بطور خاص اس دور میں لکھنؤ سے ہفت روزہ 'اودھ' اور 'اودھ پنچ' شائع ہوئے، دونوں مکمل اور مقبول اخبار تھے۔

تیسرا دور: ۱۹۰۱-۱۹۴۷ء تک یہ دور اردو صحافت کا عہد زریں تھا، اس دور میں بڑے معرکۃ الآرا قسم کے اخبارات منظر عام پر آئے۔ 'زمیندار' لاہور، 'اردوئے معلا' علی گڑھ، 'الہلال' کلکتہ، 'ہمدرد' دہلی، 'مدینہ' بجنور، ہفت روزہ 'سچ' لکھنؤ، 'الجمیعۃ' دہلی، 'الہند' کلکتہ، 'پرتاب'

لاہور، 'ملاپ' لاہور، 'انقلاب' بمبئی، 'عصر جدید' کلکتہ، 'آزاد ہند' کلکتہ، 'پاسبان' بنگلور، روز نامہ 'روشنی' سری نگر، روز نامہ 'خدمت' سری نگر، روز نامہ 'مسلمان' مدراس، روز نامہ 'اتحاد' پٹنہ، روز نامہ 'ندیم' بھوپال، روز نامہ ہندوستان' بھوپال، ان میں سے بہت سے اخباروں پر آزادی کے طوفان کو ہوا دینے کے الزام میں قیامتیں ٹوٹ پڑیں۔

چوتھا دور: ۱۹۴۷-۱۹۹۰ء تک، اس دور میں سابقہ ادوار سے زیادہ اخبارات منظر عام پر آئے اور صحافت نے نئی نئی دنیائیں سر کیں، اس دور کے خاص خاص اخبارات حسب ذیل ہیں:

'ہند سماچار' جالندھر، 'سیاست' حیدر آباد، 'سالار' بنگلور، 'منصف' حیدر آباد، 'آبشار' کلکتہ، 'عکاس' کلکتہ، اخبار مشرق' کلکتہ، عزائم' لکھنؤ، 'ساتھی' پٹنہ، 'سنگم' پٹنہ، 'قومی تنظیم' پٹنہ، 'عظیم آباد اکسپریس' پٹنہ، 'پندار' پٹنہ، اردو ایکشن' بھوپال، 'اردو ٹائمز' بمبئی ہفت روزہ 'اخبار عالم' بمبئی، ہفت روزہ 'بلٹز' بمبئی ہفت روزہ 'آئینہ' ہفت روزہ 'نشیمن' ہفت روزہ 'نئی دنیا' ہفت روزہ 'آئینہ' ایک مثالی اخبار تھا، 'بلٹز' نے عوام وخواص میں بڑی مقبولیت حاصل کی تھی، اس کی اشاعت ایک لاکھ ستر ہزار تک جا پہنچی تھی، 'نشیمن' نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی، اس کا کالم 'تھپڑ اخیں' عام و خاص میں بے حد مقبول کالم رہا ہے، 'نئی دنیا' دہلی جو کبھی روزنامہ ہوا کرتا تھا ۱۹۷۱ء میں ہفت روزہ ہو گیا، اس کا بھی اپنا ایک مخصوص انداز ہے اور اس کی اشاعت بھی لاکھوں سے متجاوز ہے۔

پانچواں دور: اس دور میں سابقہ ادوار کے علاوہ بہت سے نئے اخبارات منظر عام پر آئے، کیونکہ اس دور میں اکیسویں صدی کی آمد آمد تھی، اور یہ صدی نئی ٹکنالوجی سے نئی نئی سہولتوں کے دروازے کھولنے جارہی تھی۔

ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پنجاب جو کبھی اردو صحافت کا گہوارہ ہوا کرتا تھا، وہاں اب اردو صحافت ندارد ہے۔ ۱۸۵۷ء کی آزادی سے پہلے سے لے کر ۱۸۸۹ء تک تحفہ، ہندو پرکاش، سفیر ہند، ریاض ہند، امرتسر گزٹ، عزیز الہند ہفت روزہ وکیل، ہفت روزہ جہاں، ہفت روزہ مسلمان، یہ سارے اخبارات پنجاب سے شائع ہوتے تھے۔ پھر چمن ہند ہفت روزہ بہار، شملہ گزٹ، پائے تخت ہفت روزہ ہریانہ پنچ، پندرہ روزہ ہریانہ اخبار ہفت روزہ مرچنٹ، انبالہ گزٹ، خیر اندیش ہفت روزہ لسان الہند، جیسے اخبارات شملہ، انبالہ اور ہریانہ سے نکلتے تھے، اب نہ صرف یہ کہ ان جگہوں سے اخبارات نہیں نکلتے بلکہ ان جگہوں تک اب اردو اخبارات کی رسائی بھی نہیں ہوتی۔

۱۹۴۷ء میں یہ ملک دولخت ہوا تو ہزاروں خاندان بٹے، دل ٹوٹے، جذبات لٹے، گھر اجڑے، انسانیت پامال ہوئی، عزتیں برباد ہوئیں، خون ارزاں ہوا اور شیطان اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا، تاریخ کے اس روح فرسا حالات کے بھنور میں عزت و ناموس کا جو نقصان ہوا وہ تو ہوا ہی، مگر اردو زبان اور اردو صحافت کا نقصان بھی کچھ کم نہیں تھا، ابھی آپ نے سنا کہ مشرقی پنجاب جو کبھی اردو کا گہوارہ تھا، وہاں سے اردو کا نام ونشان مٹ گیا، سب سے بڑا نقصان تو اس زبان کے ساتھ یہ ہوا کہ آزادی کی شمعیں روشن کرنے والی زبان، توپوں اور گولیوں کے وار کا مقابلہ کرنے والی زبان، انقلاب کی روح دے کر آزادئ وطن کا صور پھونکنے والی زبان، پریم وآشتی کا گیت گانے والی اور دلوں کو جوڑنے والی زبان کے بھی حصے بخرے کر دیے گیے اور اسے مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال کر خالص ہندوستانی زبان کو زبردستی مسلمان بنا دیا گیا اور آزادی کے بعد جیسے مسلمانوں کی زندگی کے سامنے پہاڑ جیسے مسائل اور مذہبی نفرتوں کی دیواریں کھڑی کی گئیں، یہی حشر اس زبان کے ساتھ بھی ہوا، کیا جس اردو کو ہندوستان کی بیٹی کہا جاتا ہے، جس ہندوستان کو ناری اور اس کی دو زبانوں ہندی اور اردو کو اس کی دو حسین آنکھوں سے تشبیہ دی جاتی ہے، اس بیٹی اور اس سندر ناری کی ایک آنکھ کے ساتھ یہ سلوک اور سوتیلا برتاؤ کیا گیا!! لیکن جس طرح سے یہاں کے مسلمان مصائب ومشکلات کی ہر دیوار کو پاٹتے ہوئے، اپنے وجود و بقا کی جنگ لڑتے ہوئے اور ملک سے وفاداری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے

مسلسل پیش قدمی کر رہے ہیں، اردو بھی اپنے وجود کو منواتے آئی ہے، اس کی صحافت ہزارہا رکاوٹوں کو دور کر کے شاہراہ ترقی پر دھیرے دھیرے آگے بڑھی ہے اور بڑھتی جارہی ہے۔

کئی بڑے شہروں میں اخبارات بند ہوئے، پڑھنے والوں اور خریداروں کی تعداد روز بروز کم ہوتی گئی، سرکاری اشتہارات کے معاملے میں آنا کانی کی گئی، ایجنسیوں نے تعصب، جانبداری اور عدم تعاون کی پالیسی اپنائی، حکومتوں نے اسے نظر انداز کیا، لیکن صحافت نے تو جیسے طے کر رکھا تھا کہ آدھا پیٹ کھا کر، سر پر کفن باندھ کر اور مرتے دم تک اپنا سفر جاری رکھے گی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج وہ پوری طرح سے زندہ بلکہ توانا اور طاقتور ہے۔

اردو زبان اور اردو صحافت کو جن چیلنجوں اور مشکلات کا سامنا ہے، وہ ایک طویل تحقیقی مقالے کا موضوع ہے، مگر ہے ایک تکلیف دہ داستاں۔ اسے اپنوں کی بے اعتنائی اور لاپرواہی کا سامنا رہا، حکومتوں نے اسے اپنا نہیں سمجھا۔ اتر پردیش کے ڈھائی لاکھ اسکولوں میں اردو نہیں پڑھائی جاتی، اگر پرائمری سطح سے اردو نہ پڑھائی جائے، اسے اقتصادیات (ecnomic) سے نہ جوڑا جائے اور جب تک اسے سیاست کے ایوانوں میں نہ لایا جائے، تو کسی 'اردو یونیورسٹی' کے قیام سے اس کے بنیادی مسائل حل ہو ہی نہیں سکتے۔

اردو صحافت کے مسائل و مشکلات دوسری زبانوں کی صحافت کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ ہیں۔ سوا ارب آبادی والے اس ملک میں اخبارات پڑھنے والوں کی تعداد ۱۵-۱۶ کروڑ ہے، اگر مردم شماری کے اعداد و شمار کو درست مانا جائے تو اردو جاننے والوں کی تعداد ۴۵ کروڑ کے لگ بھگ ہے، تعداد کے لحاظ سے اردو اخبارات ہندی اور انگریزی کے بعد تیسرے نمبر پر آتے ہیں، یہ بات صحیح ہو تب بھی یہ افسوس کا مقام ہے کہ اردو کے کسی اخبار کی اشاعت لاکھ تک پہنچ نہیں پاتی۔

پھر اخبار خرید کر پڑھنے والوں کی قلت ہے، ہمارے یہاں بیڑی اور اخبار مانگ کر پڑھنا کہیں عیب سمجھا ہی نہیں جاتا، جو قاری اخبار خرید کر پڑھتا ہے، وہ بھی اردو کا اخبار خرید کر پڑھنا پسند نہیں کرتا، کیونکہ اتنے ہی پیسوں میں میٹر، پرنٹنگ اور ضخامت کے لحاظ سے ہندی یا انگریزی کا اخبار مل جاتا ہے، جو ظاہری دلکشی اور شاید معنوی اعتبار سے اردو اخبار سے بدرجہا فائق ہوتا ہے۔

ایک پیچیدہ مسئلہ اشتہارات کا بھی ہے، اردو صحافت کا دائرۂ اثر اور سرکولیشن (circulation) کم ہوتا ہے، اس لیے اُسے بہت کم اشتہارات ملتے ہیں، اشتہارات سے محروم اخبارات کا حال اس اپاہج یا دائمی معذور بھوکے انسان کا سا ہوتا ہے جو روزانہ دو روٹی کے لیے ہمیشہ پریشان رہتا ہو۔

اردو صحافت کا تعلق پورے ہندوستان سے ہے، ملک کے ہر گوشے سے اخبارات نکلتے ہیں؛ انقلاب، ملاپ، تیج، ہند سماچار، آزاد ہند، راشٹریہ سہارا، اقرأ، مشرق، سیاست، سالار، رہبر دکن، آگ، فاروقی تنظیم، دعوت، ہمارا سماج، ہندوستان اکسپریس، قومی خبریں، صحافت، جدید خبر، جدید میل، جدید عمل، ہمارا مقصد، چٹان، ارمغان، کشمیر عظمیٰ، دائمی پرواز، اکسپریس، صدائے اودھ، نئی دنیا، الجمیعۃ، وغیرہ..... ماہناموں میں شمع، پاکیزہ آنچل، ہدیٰ، ھما، خاتون مشرق، زندگی، دارالعلوم، ارمغان دعوت، افکار ملی، تعمیر حیات، معارف، الحسنات، النور، بتول، ذکری، بچوں کی دنیا، بانگ حراء، تعمیر ملت، ندائے شاہی، اذان بلال، حراء کا پیغام، نوائے ہادی، بزم سہارا، نقوش اسلام، اردو ریویو وغیرہ۔ اس وقت تو صورت حال یہ ہے کہ ہر قابل ذکر دینی ادارہ اپنا ترجمان نکال رہا ہے، یہ سارے ہی اخبارات بڑے تو نہیں کہے جا سکتے، تاہم مارکیٹ میں پابندی سے آتے ہیں اور اپنا اپنا حلقۂ اثر رکھتے ہیں۔

بدقسمتی سے اردو زبان-آزادی کے بعد-اس طبقے کی مخصوص زبان سمجھ لی گئی ہے، جو اس ملک میں مسلمان کہلاتا ہے اور جس کی اکثریت اس وقت غریب، ناخواندہ اور پس ماندہ ہے، پھر اس زبان کے بولنے والوں میں پڑھنے کا شوق بھی رخصت ہو چکا ہے، یہ ایک بڑی وجہ ہے

کہ اردو صحافت کا کوئی بھی اخبار یا کوئی سی بھی کتاب کی اشاعت لاکھوں کو چھو نہیں پاتی، اشاعت کی کمی اسے اشتہارات سے محروم رکھتی ہے، اشتہارات سے محرومی اسے صنعت نہیں بننے دیتی اور دور حاضر میں صحافت جب تک صنعت نہیں بن پائے گی وہ اشتہارات سے محروم ہی رہے گی اور جب تک یہ صورت حال برقرار رہے گی، اردو صحافت سے جڑے ہوئے لوگوں کا معیار تنخواہ پست رہے گا، معیار تنخواہ کی پستی کی وجہ سے باصلاحیت افراد کی خدمات عموماً حاصل نہ ہو سکے گی، بڑے اخبارات صنعت سے جڑے ہوئے ہیں، یہ ذہن نشیں رہے کہ کوئی اخبار اپنی قوت فروخت کی بنیاد پر قائم نہیں رہ پاتا۔

تاہم اردو صحافت کو صنعت کا درجہ مل بھی جائے تو کچھ فوائد کے ساتھ ساتھ اس کے نقصانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس کے نقصانات میں بند، ہڑتالیں، تحریکیں اور تالا بندیاں تو شامل ہیں ہی مگر میری مراد اُن معنوی نقصانات سے ہے جو صحافت کی صنعت کے پس پردہ ہمارے ازلی دشمنوں (یعنی صہیونیوں) کی سازشوں سے پہنچ سکتے ہیں، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

'کارپوریٹ سکٹر نے اردو صحافت کی زلف کو سنوارنے کی طرف پیش رفت کی ہے، بہت سے افراد یہ خیال کرتے ہیں کہ کارپوریٹ سکٹر کا داخلہ اردو صحافت کے مستقبل کے تئیں خوش آئند ہے، وہیں بیشتر لوگوں کا ماننا ہے کہ ان کا قدم اردو صحافت کے لیے خوش آئند نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کرنے کی جانب ایک قدم ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ یوں تو میڈیا پر صہیونیت کا قبضہ ہے ہی مگر اب تک اردو کلی طور پر اس کی زد میں نہیں تھی، مگر اب صہیونیت کارپوریٹ کے ذریعہ اردو میں بھی بے سروپا مواد داخل کرنے میں مصروف ہے' (یو این این کی رپورٹ)۔

پہلے عرض کیا گیا تھا کہ اردو صحافت نے روز اول سے کسی عظیم مشن کو مطمح نظر بنایا ہے، صحافتی مقاصد کے ساتھ ساتھ قوم و ملک کی خدمت اس کے پیش نظر رہی ہے، اس مقصد کو پانے کے لیے اخبار کو زندہ رکھنا ضروری تھا اور اسے زندہ رکھنے کے لیے ملت کے بہی خواہوں کو اپنی جائدادیں لٹانی پڑیں، خون جگر سے اسے سیراب کرنا پڑا، تب کہیں جا کر وہ جذبۂ حب الوطنی اور سرفروشی کی تمنا پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی، سماجی برائیوں کی بیخ کنی کرنے میں ہمیشہ قائدانہ اور مصلحانہ قسم کے کارنامے انجام دیے۔

آج بھی اردو صحافت کا معیار شرافت و مروت و انسانیت بہت بلند ہے، ہر زبان کی صحافت سے بڑھ کر اسے انسانی اقدار کا پاس و لحاظ ہے، جبکہ غیر اردو صحافت میں منفی رویہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا منفی تصور اب اتنا پختہ ہو گیا ہے کہ وہ اردو صحافت کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتی۔

غیر اردو صحافت پہ خبریں چھپانے کا الزام عائد ہوتا رہتا ہے، عموماً یہ فرقہ واریت کو ہوا دینے کے کام کو بہتر خیال کرتی ہیں، بعض بڑے اخبارات تو فرقہ واریت ہی کو فروغ دینے کے نتیجے میں خوب پھل پھول رہے ہیں، اگر حکومت ان کے مقابلے میں سنجیدہ ہوتی اور دانشمندی سے غور کرتی تو ایسے اخبارات کی مراعات اور اشتہارات روک دینے کا فیصلہ لے کر سبق سکھا سکتی تھی، لیکن جب حکومت ہی فرقہ واریت کے سامنے ہتھیار ڈال دے یا سرے سے خاموش تماشائی بنی دیکھتی رہے، تو پھر کس سے گلہ کرے کوئی۔

اشتعال انگیزی اور سنسنی پھیلانا بھی غیر اردو صحافت کا وطیرہ بن چکا ہے، حالانکہ اشتعال انگیزی کرنا کسی پر بندوق چلانے سے کم خطرناک نہیں ہے، پھر ایسا کرنا صحافت کے اصولوں کے بھی خلاف ہے، خبر کتنی ہی ہولناک اور سچی ہو اسے اس طرح پیش کرنا کہ منافرت اور بغض و عناد کے جذبات کو ہوا ملے، قوم و ملک کی کوئی اچھی خدمت نہیں ہے۔

ملک میں بدقسمتی سے فسادات ہوتے ہیں، گھر اجڑتے ہیں اور اپنے ہی وطن میں مظلومین پناہ گزین بن کر رہ جاتے ہیں، ایسے میں بہت سے غیر اردو اخبارات کا کردار حد درجہ مشکوک اور قابل اعتراض ہوتا ہے، یہ آئے دن کی باتیں ہیں، صحافت ایک ہتھیار

ہے اسے مظلوم کے حقوق کی بازیابی، پسماندہ لوگوں کی ترجمانی اور غلط کارلوگوں کی ہمت شکنی کے لیے استعمال ہونا چاہئے۔

آج اخلاقی زوال اپنی حدیں چھورہا ہے، اس زوال کا اثر صحافت کے صفحات پر بھی دیکھا جاسکتا ہے، صحافت کا کام روشنی دکھانا اور گرتے ہوئے معاشرے کواوپر اٹھانے کے لیے فکری راستہ ہموار کرنا ہے۔

جانبداری، ناانصافی اور عدم توازن تو جیسے ہندوستانی صحافت کے خمیر میں شامل ہے، ہندوستان جیسے ملک میں کرکٹ کی خبروں کو جنون کی حد تک نمایاں کرنا حیرت انگیز بھی ہے اور حماقت بھی، جس ملک میں ۳۵ کروڑ افراد روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے ترستے ہوں، جہاں ۳۷ کروڑ افراد مزدوری کرکے جیسے تیسے پیٹ بھرتے ہوں، جہاں ۱۰ کروڑ معصوم بچے مزدوری کرنے پر مجبور ہوں، ان سب حقائق کو نظر انداز کرکے امیروں یا ان کے بچوں کے لیے کرکٹ کی سہ شرخیاں قائم کرنا اور پورا صفحہ ان کے لیے مخصوص کرنا غیر متوازن رویہ بھی ہے اور افسوس ناک بھی، جبکہ غربت کے خاتمہ کے لیے چند سینٹی میٹر کا کالم بھی پابندی کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جاتا۔ صحافت کو توازن، انصاف، حقیقت پسندی اور غیر جانبداری سے کام لینا ہوگا۔

اردو صحافت اگر پسماندہ رہ کر بھی اپنے مشن کا شعور رکھتی ہے اور سماج کو مثبت شعور دینے کا کام کرتی ہے، تو اس صنعتی اور مصنوعی، پر کشش اور دل آویز صحافت سے بدرجہا بہتر اور قابل ستائش عمل ہے جو پھل پھول تو رہے ہیں مگر سیکولرازم کے پردے میں تعصب، فرقہ واریت اور منافرت کو ہوا دے کر ملک کو کمزور کررہے ہیں، اس کام میں سب سے زیادہ پیش پیش سیاسی بازی گر ہوتے ہیں، جن کے لیے سیاست خدمت کا نام نہیں بلکہ لوٹ کھسوٹ، استحصال، نفع اندوزی کی پالیسی اور ناجائز ہتھکنڈوں سے حصول زر کا نام ہے۔ یو این این کے حوالے سے کہا گیا ہے:

''آج سیاست سے شفافیت عنقا ہے، اسی طرح صحافت سے بھی شفافیت دور ہوتی جارہی ہے، سیاست کا آج صحافت پر دبدبہ ہے، اس لیے وہ بھی اس کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی، صحافت پر سیاست کے غلبہ کی وجہ سے اس کا سب سے اہم عنصر بھی غائب ہوتا نظر آرہا ہے، صحافت اور صحافیوں کا خمیر دراصل جوانمردی، اولوالعزمی، بلند حوصلگی اور بے باکی سے تیار ہونا چاہئے، اس میں رتی برابر بھی بدعنوانی کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے، مگر افسوس کہ سیاست نے ان اوصاف پر دبیز پردے ڈال دئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ علی العموم صحافیوں سے بلند حوصلگی اور بے باکی کی صفت سلب ہوتی جارہی ہے، اسی کے زیر اثر صحافی برادران بھی حق گوئی سے کترانے لگے ہیں'۔

صفدر امام قادری کہتے ہیں: 'ہندوستان کی اردو صحافت روایت اور جدت کے دوراہے پر کھڑی ہے، روایت سے اسے ادبی شان اور سماجی جوابدہی کی پونجی حاصل ہوئی تھی، اس نے جفاکشی کے ساتھ بے باکی سیکھی تھی، لیکن ٹیکنالوجی اور کارپوریٹ لازمیت نے اردو صحافت کو ایک الگ زمین پر لاکر کھڑا کردیا ہے۔ اب ادب اور ادبیت کی کون کہے، عام قواعد اور انشا کے کھلواڑ روزانہ صبح سے ہمارا امتحان لیتے ہیں، جلدی میں خبریں یا ان پر تاثرات پیش کردینے کا جبر ہمیں روزانہ حقائق کی بھول اور معیار کی پستی میں پہنچا رہا ہے، سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ رنگین اور روشن چھپائی نے ہم سے دھیرے دھیرے جتنا کچھ چھین لیا ہے، اس کی تلافی ابھی ہوتی دکھائی نہیں دے رہی ہے' (راشٹریہ سہارا ۲۵ ستمبر ۲۰۱۵)۔

الحمدللہ اردو صحافت یاران تیز گام کی تمام تر بے توجہیوں، اپنوں کی بے اعتنائیوں اور نادان یاروں کی خشت باریوں کے باوجود اعلیٰ انسانی قدروں پر مشتمل ہے، اپنے صحافتی مشن کو زندہ رکھے ہوئے ہے، اس لیے بھی زندہ رکھے ہوئے ہے کہ ارباب مکر وسیاست کی مہربانیوں کی وجہ سے اردو صحافت 'مسلمان' بنادی گئی ہے، تو اس نے بھی اب طے کرلیا ہے کہ اس ملک میں مسلمان ہی بن کر زندہ رہے گی، وہ نہ تو اب پیاری اردو زبان سے دستبردار ہوگی، نہ صحافت کے اپنے مشن سے اپنا رشتہ منقطع کرے گی۔

☆☆☆

❑ صحافت

کتاب اور اردو صحافت

محمد عارف اقبال

اردو صحافت کی تاریخ کا ذکر ہوتا ہے تو بات مولوی باقر کے محاسن سے شروع ہوتی ہے، پھر محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، سرسید احمد خاں اور دیگر اکابر صحافیوں اور دانشوروں کی مشنری صحافت پر ختم ہوجاتی ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں اردو صحافت 'مشن' ہوا کرتی تھی۔ تاہم صحافت کے پردے میں اس بات کو فراموش کر دیا گیا ہے کہ جس پریس سے اردو اخبار شائع ہوا کرتا تھا، اس کا اصل مقصد علمی، تحقیقی اور ادبی کتابوں کی اشاعت تھا۔ اس وقت اخبار کی اشاعت کا جذبہ کلیتاً تحریکی اور مشنری تھا۔ صحافت کا استعمال ہندستان کو انگریزوں کی غلامی اور ظلم سے آزاد کراتا تھا۔ بالآخر وہ دور پیش بہا قربانیوں کے ساتھ ختم ہوگیا۔

'اردو صحافت' نے جب آزاد ہندستان میں بھی اپنے 'مشن' کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا تو اس کے 'مشن کی ترجیحات' میں زمینی تبدیلیاں واقع ہوچکی تھیں۔ اب اس کی ترجیحات میں چند اقدار پر مبنی اردو اخبارات کو چھوڑ کر تین بنیادی چیزیں تھیں: سیاست واقتدار، سستی شہرت، دولت کا حصول۔ اردو کے بیشتر اخبارات (روزنامہ ہفت روزہ وغیرہ) نے اپنی ترجیحات کے پیش نظر ان کی آرائش پر خصوصی توجہ مرکوز کی تاکہ اردو کے قارئین 'صبح کی چائے' کی طرح ان اخبارات کے بھی گرویدہ اور عادی ہوجائیں۔ یہاں ذکر فی الوقت 'اردو صحافت' کا ہے۔ لہٰذا اسی دائرے کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ اس 'مشن' میں دیگر زبانوں کے اخبارات بالخصوص انگریزی اخبارات بھی شامل ہیں لیکن ان کا انداز اردو اخبارات سے جدا ہے، کیوں کہ ان کی ''خرابیاں'' بھی اردو اخبارات کو میسر نہیں اور ''خوبیاں'' تو شاید اردو صحافت کے نصیب میں ہی نہیں ہیں۔ آج سے تقریباً 45 برس قبل اردو دنیا کے لاثانی ادیب وتخلیق کار ابن صفی کے ایک ناول 'پاگلوں کی انجمن' (جون 1970) کا ایک مکالمہ ملاحظہ کیجیے:

''ہم اردو کے اخبار نہیں دیکھتے!''

''دیکھا کیجئے..... ایمان تازہ ہوتا ہے..... ایک صفحہ پر درسِ قرآن پڑھیے اور دوسرے صفحہ پر ننگی چھپکلیوں کی تصویریں بھی دیکھ لیجیے!''

اس سے تین سال قبل لکھے گئے ابن صفی کے ایک ناول 'دیو پیکر درندہ' (اگست 1967) کا یہ مکالمہ بھی پڑھیے:

''بڑی عجیب بات ہے!'' کرنل گراہم سر ہلا کر بولا۔ ''میں نے آج کا اخبار نہیں دیکھا!''

''دیکھتے بھی تو کیا ہوتا۔ اخبارات تو صرف اغوا اور عصمت دری کے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں اور اندازِ بیاں اتنا لذت انگیز ہوتا ہے کہ آج کل فحش ناول نگار بیٹھے مکھیاں مار رہے ہیں!''

حمید سانس لیے بغیر بولتا چلا گیا۔

''کیا خیال ہے آپ کا، اخبارات کی روش کی بنا پر چٹ پٹے ناولوں کی سیل کم ہوگئی ہے..... اور..... بازاروں میں حیرت انگیز کیپسول کی بھرمار ہوگئی ہے..... ایک کیپسول کھا لیجئے..... بارہ مسالے کی چاٹ!''

اندازہ کیجئے کہ آج کی اردو صحافت پر 'اردو میڈیا' ہونے کا نشہ طاری ہوا تو اس نے کیا گل کھلایا ہے ___ موجودہ اردو صحافت، جو قومی انگریزی میڈیا سے اپنے فن، پروفیشن اور علمی وادبی وقار کے لحاظ سے کوسوں دور ہے، اس کی تقلید میں نہیں بلکہ 'نقالی' میں ید طولیٰ رکھتی ہے۔ بات یہاں ان مشروم کی طرح پھیلے ہوئے چھوٹے اردو اخبارات کی نہیں ہے جو مشکل سے ۵۰ عدد چھپتے ہیں، حتی کہ عوام ان کے دیدار

سے بھی محروم رہتے ہیں لیکن ان کا اندراج DAVP میں تیس سے چالیس ہزار ہوتا ہے۔ یہاں ذکر ملک کے ان اہم اخبارات کا ہے جن کا 'مشن' انہی تین چیزوں کا حصول ہے یعنی سیاست و اقتدار، سستی شہرت، دولت کا حصول (اب ذریعہ حصول کی بھی کوئی قید نہیں)۔ ظاہر ہے کہ ان کے حصول کے لیے مختلف الخیال عوام کے 'ذوق' کا لحاظ ضرور کیا جاتا ہے۔ اگر اردو کے یہ اخبارات 'عوام کے ذوق' کو ملحوظ نہ رکھیں تو ان کی ضمانت بھی ضبط ہوسکتی ہے، ان اخبارات کے مالکان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تاریخ رقم کررہے ہیں، لیکن اس بات کو فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ ان کے 'اعمالِ صالحہ' کو ضبطِ تحریر میں لایا جارہا ہے اور تعمیری لحاظ سے تاریخ ان کا ساتھ کبھی نہیں دے سکتی۔ آپ غور کیجئے کہ ہمارے سماج میں اخلاقی اقدار کا حامل ایک ادیب جب یہ کہتا ہے کہ ''اردو اخبارات دیکھا کیجئے.....ایمان تازہ ہوتا ہے.....ایک صفحہ پر درسِ قرآن پڑھیے اور دوسرے صفحہ پر ننگی چھپکلیوں کی تصویریں بھی دیکھ لیجیے!'' چند الفاظ میں ایک ادیب نے 'اردو صحافت' پر کتنا بلیغ تبصرہ کیا ہے۔ کتنا لطیف استعارہ ہے 'ننگی چھپکلیوں' کا۔ 'اردو صحافت' نے خاص طور پر گزشتہ چار دہائیوں سے مذکورہ تینوں عنوانات سیاست و اقتدار، سستی شہرت، دولت کے حصول کے تحت اپنے 'مشن' کو جاری رکھا ہے۔ پہلے عنوان کے تحت ہر چار پانچ سال میں ترجیحات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ بقیہ دو عنوانات سدا بہار ہیں۔ پہلے عنوان کے تحت بعض اوقات اردو صحافت 'قومی میڈیا' پر بھی چڑھ دوڑتی ہے لیکن 'مانگے کا اجالا' ہمیشہ اسی سے حاصل کرتی ہے۔ آج کی اردو صحافت معلومات، فن اور تکنیکی اعتبار سے اس درجہ پس ماندہ ہے کہ اس کا انحصار محض 'غیر ضروری خبروں اور مضامین' پر ہوگیا ہے۔ گزشتہ تقریباً دو دہائیوں سے بیشتر اردو اخبارات کا شکم 'بے ہودہ اور فحش اشتہارات' تعزیتی بیانات اور کسی سیاسی خبر پر ردِ عمل کے طور پر ارسال کیے جانے والے بیانات سے پُر کیا جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ کسی اہم شخص کے مرنے کی بعض اوقات مکمل خبر بھی شائع نہیں ہوتی، تاریخ وفات بھی نہیں بتائی جاتی لیکن اس شخص کے مرنے کے تعزیتی بیانات کا سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہتا ہے۔ دوسری طرف اخبارات کی سرخیوں اور بین السطور میں اغلاط کی بھرمار رہتی ہے۔ خبروں میں تکرار اس قدر ہوتا ہے کہ جس خبر کو اردو اخبار کا رپورٹر دو سو الفاظ میں تیار کرتا ہے، اگر فن و تکنیک کا ماہر ایڈیٹر اسے تیار کرے تو اس خبر کے لیے تیس سے چالیس الفاظ کافی ہوں گے۔ اردو زبان و ادب اور قواعد کے لحاظ سے اردو کے یہ اخبارات انتہائی پستی کی طرف جارہے ہیں۔ ان سے وابستہ مدیران کو اڈیٹنگ کا شعور بھی نہیں ہوتا۔ رہی سہی کسر انٹرنیٹ نے پورا کردی ہے کہ تساہلی اور پس ماندگی کا دَروا ہوچکا ہے، کچے پکے مضامین کا حصول آسان ہوگیا ہے، جو اکثر اِڈٹ کیے بغیر شائع کردیے جاتے ہیں۔

موجودہ اردو صحافت کو بلاشبہ پس ماندگی اور زوال کا بخوبی احساس ہے، لیکن اپنی کمزوری کا بوجوہ اظہار نہیں کرتی، اس لئے اردو صحافت آئے دن 'مسالہ دار موضوعات' کو قومی مسئلہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ ان دنوں 'مدارس اسلامیہ' کے نام پر خصوصی نمبر شائع کرنے کا رجحان عام ہوگیا ہے۔ اس کے برعکس ملک کے عوام غربت و افلاس، تعلیمی مسائل، رہایش کے مسائل، روزگار کے مسائل، صنعت اور کارخانے کے مسائل اور نہ جانے کتنے مسائل میں مبتلا ہیں، لیکن اردو اخبارات کے پاس ایسی 'تفتیشی ٹیم' بھی نہیں جو ان مسائل کو منظر عام پر لاتی اور اردو قارئین کو اپنے سروے اور تجزیے سے باخبر کرتی۔ ہاں! نقالی میں کبھی کبھی 'دوسرے کے مال' کو 'اپنا مال' بنا کر پیش کرنا ان کا 'طرہ امتیاز' ہوگیا ہے۔

اب ان اخبارات کے مالک یا مالکان کی ایک مہم یہ بھی ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کی بقا کا ضامن بھی خود کو سمجھنے لگے ہیں۔ ان کے نزدیک جو بھی اردو کا اخبار خرید کر نہیں پڑھتا وہ 'اردو دشمن' ہے۔ ان پر یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ اردو کی بقا صرف تعلیم میں ہے اور تعلیم کا راست تعلق کتاب سے ہے۔ اردو زبان اور اردو عوام کے ساتھ یہ کتنا پرفریب مذاق ہے کہ 'کتاب کے فروغ' کی جگہ اب باسی، چبائے ہوئے لقمے، غیر معیاری اور کسی درجے میں فحش تحریروں کو 'اردو کی بقا' کا ضامن قرار دیا جارہا ہے۔ حالانکہ دانشوروں کا یہی قول معتبر ہے کہ: ''کتاب تنہائی کی بہترین دوست، زندگی کا سرمایہ اور انسانی ورثہ کے تسلسل کی ضمانت ہے۔''

☆☆☆

❑ نقد ونظر

راشد شاز اور عمل صالح

محمد غزالی ندوی

شاز صاحب نے اہل مغرب کو عمل صالح میں قائدانہ تفوق کا حامل قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انہیں ایجادات میں سبقت حاصل ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اس وقت دنیا میں انسانی زندگی کو نئی سمت دینے، معیار زندگی بلند کرنے، خدا کی کائنات کی تسخیر، خشکی، سمندر اور فضاؤں میں بہتر امکانات کی تلاش، رسل ورسائل کی سہولیات، سفر وحضر کی آسائشیں اور اس جیسے جتنے اعمال صالحہ انجام پا رہے ہیں بدقسمتی سے قومی مسلمانوں کا حصہ اس میں خاصہ کم ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عمل صالح کے اس عالمی مشن میں مشرق سے افرادی قوت گاہے بگاہے ضرور ملتی رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس عمل میں قومی مسلمانوں کی شرکت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ گزشتہ تین سو سالوں میں اس علمی اور اکتشافی معرکے کی قیادت ہمارے ہاتھوں میں نہیں رہی ہے'' مزید لکھتے ہیں: جہاں دوسری قوموں نے عمل صالح کے عالمی پروجیکٹ پر اپنا قائدانہ تفوق برقرار رکھا ان کی پیش قدمی مسلسل جاری رہی، وہیں ہم عمل صالح سے یکسر کٹ کر رہ گئے۔ (راشد شاز، اسلام: مسلم ذہن کی تشکیل جدید ص ۴۸۔۵۰)

اس میں شک نہیں کہ فائدہ مند ایجادات اگر نیک نیتی کے ساتھ کی جائیں تو بلاشبہ یہ ایک نیک کام ہے؛ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ جس طرح شاز صاحب نے اہل مغرب کے شرک اور دوسری تمام برائیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف مفید ایجادات کی بنیاد پر انہیں عمل صالح میں قائدانہ تفوق کا حامل مانا ہے، کیا یہ رویہ معروضی، غیر جانبدارانہ اور علمی منہج کا آئینہ دار ہے؟ کیا اہل مغرب حقیقت میں اپنی ایجادات کے ذریعہ ''عمل صالح'' میں مسلمانوں سے بڑھ گئے ہیں؟ اس سوال کا جواب پانے کے لیے دو باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ ایجادات کرنا انسان پر لازم ہے یا اختیاری؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی دو شخص بھی اس میں اختلاف نہیں کریں گے کہ ایجادات کرنا کسی انسان پر ضروری نہیں ہے؛ بلکہ اختیاری ہے۔ یہ جاننے کے بعد کہ اہل مغرب ایک ایسے نیک عمل میں ممتاز ہیں جو اختیاری ہے، یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اللہ نے جن اعمال اور جن چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے ان میں ان کا کیا حال ہے؟ اگر اس میں بھی وہ ممتاز ہیں تو بجا طور پر وہ عمل صالح میں سب سے آگے مانے جائیں گے، ورنہ ضروری چیزوں کو چھوڑ کر صرف اختیاری چیزوں کو کرنے سے کوئی کیونکر آگے بڑھ سکتا ہے۔ اس کو اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص امتحان دے یا کوئی فارم بھرے، اس میں کچھ سوال optional ہوں اور کچھ mandatory (ضروری) تو جو انسان ضروری سوالات کے ساتھ optional کا بھی جواب دے گا، وہ تو بجا طور پر ممتاز مانا جائے گا لیکن جو ضروری سوالات کو چھوڑ کر صرف اختیاری سوالات

کے جواب دے اس کا فارم یقیناً رد ہو جائے گا۔اس نکتہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اہل مغرب کے حالات پر غور کیجیے۔

عقیدۂ توحید اور اہل مغرب

اللہ کا انسانوں سے سب سے پہلا مطالبہ توحید کا ہے۔یعنی تنہا اللہ کو پیدا کرنے والا ، رزق دینے والا ، پالنے والا اور پوری کائنات کا نظام چلانے والا مانا جائے اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، اللہ کی خدائی اور اس کی صفات میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔اس سلسلہ میں اہل مغرب کا کیا حال ہے اس کو جاننے کے لیے ہم صرف امریکا کی مثال پیش کرتے ہیں جس کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ بھی سمجھا جاتا ہے اور اسے اہل مغرب کی قیادت کا مرتبہ بھی حاصل ہے۔

۱۔ امریکا کی تقریباً ۲۱فیصد آبادی کیتھولک عیسائی ہے،اور تقریباً چھیالیس فی صد آبادی پروٹیسٹینٹ عیسائیوں کی ہے یہ دونوں تثلیث کے قائل ہیں،یعنی خدائی کو انہوں نے اللہ ، حضرت عیسی اور روح القدس کے درمیان تقسیم کر رکھا ہے۔جس کو قرآن نے صاف طور پر کفر کہا ہے ﴿لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثٰلث ثلثۃ ﴾ تقریبا ۲۲ فی صد آبادی ملحدین کی ہیں جو کسی مذہب کو نہیں مانتے،ان میں ۶ فی صد خدا کو بالکل نہیں مانتے بقیہ ۱۶ فی صد کا خیال ہے کہ خدا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا ہے،انہیں Agnostics یا قدیم اصطلاح میں ’’لاادریہ‘‘ کہتے ہیں۔ بقیہ گیارہ فی صد میں ہندو، بدھشٹ ، یہودی،عیسائیوں کے دوسرے فرقے اور مسلمان شامل ہیں،ان گیارہ فی صد لوگوں کے عقائد سے اگر قطع نظر بھی کر لیجئے تو امریکا کی ۸۹ فی صد آبادی یا تو خدا کو نہیں مانتی یا پھر تین خدا کی قائل ہے، کچھ یہی حال دوسرے مغربی ممالک کا ہے۔ان تفصیلات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اہل مغرب سب سے اہم چیز توحید کے منکر ہیں جس پر تمام اعمال صالحہ کی قبولیت کا دار و مدار ہے۔سورہ ابراہیم آیت ۱۸ میں ہے ’’جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پاسکیں گے۔‘‘ اور سورہ نور آیت ۳۹ میں ہے ’’جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب، کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا، مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا، بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا، اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی‘‘۔اور سورہ انعام آیت ۸۸ میں ہے ’’اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا‘‘۔ان آیات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اہل مغرب کی ایجادات خواہ کتنی ہی نفع بخش ہوں، اللہ کے یہاں بے وزن ہیں اس لیے کہ وہ توحید اور ایمان کی نعمت سے محروم ہیں۔اس لیے وہ عمل صالح میں مسلمانوں سے آگے اور قائدانہ تفوق کے حامل تو کیا ہوتے کسی شمار اور قطار میں نہیں ہیں۔

اہل مغرب اور اطاعت والدین

اعمال صالحہ میں خدا کی عبادت کے بعد سب سے اہم ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک ہے،اس تعلق سے بھی مغربی اور امریکی معاشرہ کی صورت حال انتہائی افسوس ناک ہے ۔ وہاں ’’خاندانی تعلقات کا نظام درہم برہم ہے،اور رشتہ داروں کے ساتھ محبت والفت کے تقاضے نایاب ہوتے جارہے ہیں،امریکی معاشرہ میں بڑھاپا موت سے بدتر عذاب ہے ،بوڑھوں کے لیے الگ مرکز قائم ہیں،جہاں ان کے کھانے پینے کا انتظام تو ہوتا ہے،لیکن وہ اس محبت کو ترستے ہیں جو صرف خون کے رشتہ کی خاصیت ہے۔ بڑے بڑے مال دار لوگوں کے ماں باپ ان مراکز میں بے چارگی کے ساتھ موت کا انتظار کرتے ہیں،اور ان کی اولاد مہینوں ؛بل کہ بعض اوقات سالوں ان سے ملنے نہیں آتی، اور جو بوڑھے گھر پر رہ جائیں،انہیں کوئی بات کرنے والا نہیں ملتا،ایسے

بوڑھوں کی طرف سے باقاعدہ اشتہارات شائع ہوتے ہیں، کہ ''ہم سے فلاں پتے پر مل کر گھنٹہ بھر بات کر لیجیے'' اور اس ہم دردی کا بسا اوقات معاوضہ بھی پیش کیا جاتا ہے، تنہائی سے اکتائے ہوئے بوڑھے بعض اوقات بے مقصد لوگوں کو فون کرتے رہتے ہیں تا کہ کچھ دیر کسی سے بات کر سکیں''۔ (جہان دیدہ: سفرنامہ امریکہ)

Nursing home diaries.com کی رپورٹ کے مطابق پچانوے یا اس سے زیادہ عمر کے تقریباً پچاس فی صد لوگ نرسنگ ہوم میں رہتے ہیں، Face the facts USA کے مطابق امریکا میں دس لاکھ سے زیادہ بوڑھے نرسنگ ہوم میں زندگی گذارتے ہیں۔ جس قوم کا اپنے ماں باپ کے ساتھ یہ رویہ ہو اسے اعمال صالحہ میں قائدانہ تفوق کا حامل اور انسانیت کا محسن قرار دینا کس قدر تعجب خیز ہے!

اہل مغرب اور جنسی بے راہ روی

امریکی معاشرہ کس قدر جنسی بے راہ روی کا شکار ہے، اس حوالہ سے ۱۹۵۰ کی ایک رپورٹ میں امریکن محقق الٹرڈ کنسی نے کہا تھا کہ پچاس فیصد امریکن مرد اور چھبیس فی صد امریکن عورتیں ازدواجی خیانت کی مرتکب ہوتی ہیں؛ جبکہ بعض دوسرے تجزیہ نگاروں کے مطابق ۲۰ فی صد سے ۲۵ فی صد امریکیوں نے اپنی بیویوں یا شوہروں کے علاوہ سے تعلق قائم کیا۔

شادی سے پہلے زنا کی صورت حال پر یہ آنکھیں کھول دینے والی رپورٹ بھی پڑھے جانے کے قابل ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ 75% سے 80% امریکی باشندے انیس سال سے پہلے مباشرت کا لطف لے لیتے ہیں۔

Starting in the 1920 s and especially after world war 11 premarital sex became more common,this was especially prevalent among women,by the end of the 20th century, between 75% and 80% of Americans had vaginal intercourse before the age of 19. "sex and society 663.666".

نیچے یونیسیف کی رپورٹ نہ صرف مذکورہ بیان کی تصدیق کرتی ہے بلکہ بتاتی ہے کہ امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا، جرمنی، فن لینڈ، آئس لینڈ اور ناروے سب کا تقریبا یہی حال ہے:

According to a 2001 unicef survey in 10 out of 12 developed nations with available data more than two thirds of young people have had sexual intarcourse while still in their teens, in iceland, germany, denmark finalnd, and the norway, the united kingdom, united states,the proportion is over 80% in Australia,the united kingdom and the united states, approximately 25% of 15 year olds and 50% of 17 unicef.2001.a years old have sex. league table of teenage births in rich nations.

Kaiser family foundation کی چونکا دینے والی رپورٹ بتاتی ہے کہ بارہویں کلاس تک کے بچوں میں سے ۱۴ فی صد بچے چار الگ الگ لوگوں کو اپنا جنسی رفیق بنا چکے ہوتے ہیں۔ ایک دوسری رپورٹ کے مطابق جو کئی ہزار لوگوں سے مل کر تیار کی گئی ہے، تقریبا پچانوے فی صد رائے دہندگان نے شادی سے پہلے جنسی تعلق قائم کیا تھا: According to finer's analysis 99 percent of the respondents had sex by age 44 and 95 percent had done so before marriage.

m.truthding.com

شادی سے پہلے جنسی تعلق امریکی معاشرہ میں کس قدر عام ہے Lawrence finer لکھتا ہے: 'Premarital sex is normal behaviour for the vast and has been for majority of Americans decades'.

اب یہ بھی دیکھ لیجئے کہ کتنے لوگ وہاں حرام کاری کو اپنا پیشہ بناتے ہیں: Hg org. leagal resources کے مطابق ہر سال ۷۰ ہزار سے ۸۰ ہزار عورتیں جسم فروشی کے جرم میں گرفتار کی جاتی ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ایک لاکھ لوگ اور دوسری رپورٹ کے مطابق دس لاکھ سے اوپر لوگ اس پیشے سے وابستہ ہیں، یعنی ہر سو عورتوں میں سے ایک عورت اس پیشہ میں یا تو ہے یا کبھی رہ چکی ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب اپنے سفرنامہ امریکا میں لکھتے ہیں ''صرف تفریح گاہوں پر نہیں، بارونق سڑکوں اور پر ہجوم بازاروں میں، ٹرینوں اور بسوں میں، اور پبلک مقامات پر برسر عام بوسہ وکنار اور جنسی التذاذ ایک عام بات ہے، جس کے پانچ سات مناظر دن بھر میں خواہی نہ خواہی نظر آ ہی جاتے ہیں، عورتوں کے لیے عریانی عیب تو کیا ہوتی، شاید مایۂ افتخار سمجھی جاتی ہے، کپڑے نام کی جو چند تہمتیں ہوتی ہیں، ستر پوشی کے نقطہ نگاہ سے ان کا بھی کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آتا، اور خاص خاص مواقع پر بالکل برہنگی میں بھی چنداں مضائقہ نہیں سمجھا جاتا، جگہ جگہ نیوڈ ڈانسرز (Nude Dancers) مادر زاد رقاصائیں کے بورڈ بڑے فخر سے لگے نظر آتے ہیں، قحبہ خانوں کے اشتہار ''مجالس حسن'' (Beauty parlours) کے نام سے برسر بازار تقسیم ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ جنسی طرز عمل کے لحاظ سے یہ قومیں بلا مبالغہ کتے، بلیوں کی سطح تک پہنچ چکی ہیں''۔

''پھر حیرت وعبرت کا انتہائی مقام یہ ہے کہ جس معاشرے میں عورت اتنی سستی اور اس سے لذت حاصل کرنا اتنا آسان ہو، جہاں عورت سے لطف اندوز ہونے کے لیے خلوت بھی ضروری نہ ہو، اور جہاں زنا بالرضا کو صرف قانونی طور پر ہی نہیں، سماجی اور عقلی اعتبار سے بھی کوئی عیب نہ سمجھا جاتا ہو، ٹھیک اسی معاشرے میں زنا بالجبر کی اتنی وارداتیں ہوتی ہیں کہ الامان!'' (جہان دیدہ: سفرنامہ امریکا) Rape statistics کے مطابق 2003 میں زنا بالجبر کے 93883 واقعات رپورٹ کیے گئے؛ جب کہ ماہرین کا ماننا ہے کہ مختلف وجوہات کی بنا پر زنا بالجبر کے زیادہ تر واقعات کی رپورٹ لوگ نہیں لکھواتے۔ ''زنا کے علاوہ ہم جنسی کا رجحان بھی انتہائی تیزی سے بڑھ رہا ہے، اور باہمی رضامندی ہو تو اس انسانیت سوز بدمذاقی میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا''۔ کیا عمل صالح میں قائدانہ تفوق اسی کا نام ہے؟

اہل مغرب کے مظالم

اہل مغرب کی مفید ایجادات کی دہائی دینا اور ان کی مہلک ایجادات اور انسانیت اور اقوام عالم پر ان کے ظلم کو نظر انداز کر دینا کسی طرح قرین انصاف نہیں ہے۔ پچھلے شمارے میں ہم نے ان کے بعض مظالم کا تذکرہ کیا تھا۔ اس شمارے میں ہم صرف ہیرو شیما پر امریکہ کے ایٹمی حملے کا تذکرہ کریں گے۔

''ایٹم بم کے گرنے سے جو تباہی پھیلی ہے اس کی تفصیلات ایک کتاب میں محفوظ کی گئی ہیں جو ۱۹۷۱ میں ہیروشیما سٹی ہال کی طرف سے پانچ جلدوں اور چار ہزار صفحات میں شائع کی گئی تھی اور اس کا جاپانی نام ہے Shi Hiroshima Genbaku Sensai یعنی ''ہیروشیما کی جنگ کی تباہی کا ریکارڈ'' اس میں لکھا ہے ''یہ بم ایک امریکی جنگی جہاز بی ۲۹ نے گرایا تھا جس کا نام Geyenola تھا اس بم کی لمبائی ایک سو بیس انچ قطر ۲۸ ۱۱ انچ اور وزن نو ہزار پونڈ تھا، یہ گرنے کے ۴۳ سیکنڈ بعد پھٹا اور اس سے پانچ

کروڑ سینٹی گریڈ گرمی خارج ہوئی، گرتے ہی ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک سو اسی فٹ قطر کا ایک گولہ پیدا ہوا جس کا اندرونی درجہ حرارت تین لاکھ سینٹی گریڈ تھا، اسی کے ساتھ پورے شہر پر ۸ء۲ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زلزلے کی شدید لہر آئی جس میں بیس ہزار ٹن کے برابر تباہ کن طاقت تھی۔

اس دھماکے کے نتیجے میں ڈھائی کلومیٹر کے علاقے کی تمام عمارتیں تو راکھ بن گئیں، ہر جگہ آگ بھڑک اٹھی، کھڑکیوں کے شیشے دو میل دور تک بکھر گئے، زلزے کے جھٹکے سینتیس (۳۷) میل تک محسوس کئے گئے، آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کم از کم آٹھ میل تک نظر آئی، پورے شہر پر دھویں کا بادل ایک چھتری کی شکل میں چھا گیا، وقفے وقفے سے زمین سے آگ کے ستون فضاء میں بلند ہوتے رہے، لوگوں نے پناہ لینے کے لیے شہر کے وسط سے سے گزرتے ہوئے دریا میں چھلانگیں لگائیں، لیکن دریا میں گرداب پیدا ہو چکا تھا، اس لیے وہ سب وہیں ڈوب کر مر گئے اور بعد میں دریا میں اتنی لاشیں نظر آئیں کہ ہر طرف سطح سے پانی بمشکل نظر آتا تھا، سڑکوں پر لاشیں بکھری پڑی تھیں، بعض حاملہ عورتوں کی لاشیں اس طرح پائی گئیں کہ ان کا پیٹ پھٹا ہوا تھا اور وہ بچہ ان کے برابر پڑا ہوا تھا جو پیدا ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو چکا تھا۔

بم گرنے کے پندرہ منٹ بعد ایک عجیب قسم کی سیاہ بارش برسنی شروع ہوئی جس میں کالے کالے اولے تھے، یہ بارش میلوں تک سوا چار گھنٹے برستی رہی اور جن کے سروں پر یہ بارش زیادہ مقدار میں پڑی ان کے سر کے بال اڑ گئے اور جن لوگوں کے پیٹ میں اس کا پانی چلا گیا، وہ چھ مہینے تک پیٹ کی بیماریوں میں مبتلا رہے، گیارہ بجے دوپہر سے سہ پہر تک شہر میں ہوا کے بگولے رقص کرتے رہے جن سے آس پاس کی آبادیوں کی چھتیں اڑ گئیں، ایک انچ موٹی پلیٹیں بھی ان بگولوں کی زد میں آ کر اڑتی نظر آئیں اور بعض انسان بھی ہوا میں اڑ کر ایک دریا کے پل سے جا ٹکرائے، دریاؤں میں پیدا ہونے والے بگولوں نے پانی کو آٹھ آٹھ فٹ اوپر اٹھا دیا۔

بم گرنے کی جگہ سے کم از کم ڈھائی کلومیٹر دور جو لوگ زندہ بچ رہے تھے، وہ بھی یا تو مذکورہ بالا تباہ کاریوں کے نتیجے میں زخمی ہوئے یا تابکاری کے اثرات سے ان کے جسم جھلس گئے، جن تک تابکاری اثرات زیادہ شدت کے ساتھ پہونچے، ان کے جسم کا گوشت بہنے لگا، بہت شدید بخار، دستوں اور الٹیوں میں مبتلا ہوئے جو بکثرت جان لیوا ثابت ہوئیں، چونکہ بیشتر ہسپتال تباہ اور ان کے ڈاکٹر ہلاک ہو چکے تھے، اس لیے ان زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا، ہنگامی طور پر جو امدادی مراکز قائم کیے گئے وہ سراسر ناکافی تھے۔

ہیروشیما پر ایٹمی حملے کے تین دن بعد امریکہ نے دوسرا ایٹم بم ناگاساکی پر گرایا، یہ چونکہ نسبتاً چھوٹا علاقہ تھا، اس لیے اس میں ہیروشیما کے مقابلے میں تباہی کم ہوئی، ہلاک ہونے والوں کی تعداد انتالیس ہزار اور زخمیوں کی تعداد پچیس ہزار تھی اور شہر کا چالیس فیصد حصہ تباہ ہوا تھا۔ (مفتی تقی عثمانی، سفر در سفر: سفر نامۂ جاپان)

یہ تو امریکا کا فعل تھا؛ لیکن دوسری مغربی اقوام کا حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے، برطانیہ، فرانس، اٹلی، اور دوسرے مغربی ممالک نے اپنی نوآبادیات میں دنیا کی مختلف اقوام پر جو مظالم ڈھائے ہیں اس کی تفصیلات چونکہ اس مختصر مضمون میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے، اس لیے دو مثالوں کو پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، مغربی اقوام نے جب ترکی کے ایک شہر ''سمرنا'' پر حملہ کیا تو وہاں کے انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اس کا حال ایک مغربی مؤرخ ''ہینیر لڈ آرم اسٹرانگ اپنی کتاب ترکی دروازہ ص۸۴۔۸۳ تاریخ دولت عثمانیہ جلد دوم ص354 میں اس طرح بیان کرتا ہے: ''انہوں نے ساحل پر اترنے کے بعد قتل عام شروع کر دیا، مکانوں میں آگ لگا دی، عورتوں کی عصمت دری کی، ٹوآن بھی لکھتا ہے کہ مغربی انا طولیہ پر

ایک بلائے ناگہانی نازل ہوگئی، جیسے کوہ آتش فشاں پھٹتا ہے، لوگ قتل ہونے لگے، زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے ،خون کی ندیاں بہتی دکھائی دیں، جو بچ رہے وہ زبردستی فوج میں بھرتی کر دیئے گئے یا جلا وطن کر دیئے گئے ،(صباح الدین عبد الرحمٰن۔اسلام میں مذہبی رواداری،ص ۲۵۷)۔

اس سے قبل ہندوستان میں برطانیہ نے جو کیا تھا اس کا حال بھی ایک انگریز مؤرخ کی زبانی ملاحظہ کیجئے :''بغاوت کے نام سے مجرموں کے ساتھ عورتیں اور بچے ہلاک کیے جارہے تھے،ان کو قصداً پھانسی نہیں دی جاتی بلکہ وہ اپنے گاؤں میں آگ میں ڈال کر جلا دیئے جاتے یا ان کو گولی ماردی جاتی ،انگریز یہ فخر کرنے میں نہیں ہچکچاتے کہ انہوں نے کسی کو نہیں چھوڑا ،ہلاک کرنا ان کے لیے خوشگوار تفریح تھی ،تین مہینے تک روزانہ لاشوں کی آٹھ گاڑیاں صبح شام تک ان مردوں کو لاتیں جو راہوں اور بازاروں میں لٹکی دکھائی دیتیں'' (اسلام میں مذہبی رواداری، بحوالہ رائز آف دی کرسچین پاوران انڈیا از کے ڈی، باسوج، ج ۵ص ۲۸۵۔

عقیدۂ توحید سے دوری،جنسی انارکی اور انسانوں پر مغربی اقوام کے ان مظالم کے بعد اس بات کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے کہ انہیں اعمال صالحہ میں کسی شمار میں رکھا جائے ، چہ جائیکہ قائدانہ حیثیت کا حامل مانا جائے ، ان کی ایجادات کی دہائی دی جائے اور انہیں انسانیت کا محسن باور کرانے کی کوشش کی جائے۔

کفار کی ترقی سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے

یہاں ایک سوال کا جواب دینا ضروری ہے کہ اگر مغربی اقوام توحید سے دور ہیں ،اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہیں اور ماں باپ کے نافرمان ہیں تو پھر وہ دنیاوی ترقیات سے کیوں سرفراز ہیں ؟ کیا یہ چیز ان کے مقبول عنداللہ ہونے پر دلالت کرتی ہے؟ کفار و مشرکین کی ترقیات پر بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے، اس لیے اللہ پاک نے پہلے ہی اس سوال کا تشفی بخش جواب ان آیات میں بیان فرمادیا ہے،سورہ توبہ آیت ۵۵ میں اللہ نے کہا ہے:''ان کے مال و دولت اور ان کی کثرت اولاد کو دیکھ کر دھوکہ نہ کھاؤ،اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں چیزوں کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی میں بھی مبتلائے عذاب کرے اور ان کی جان بھی انکار حق ہی کی حالت میں جائے''۔دوسری جگہ سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۹۶۔۱۹۷ میں اللہ نے کہا ہے:''اے نبی! دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے''۔تیسری جگہ اللہ نے سورۂ طٰہٰ آیت ۱۳۱ میں کہا ہے:''اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو دنیاوی زندگی کی اس شان وشوکت کو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے، وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دی ہے''۔

ثانیاً یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اہل مغرب کی ظاہری ترقی کی وجہ خدا کا یہ لازوال قانون بھی ہے کہ جو جس میدان میں محنت کرے گا اسے اس میں کامیابی حاصل ہوگی ،اس میں کیا شک ہے کہ اہل مغرب نے اپنی دنیا سنوارنے پر خوب محنت کی ہے اور اسی کا پھل وہ آج پارہے ہیں۔خدا کا یہ لازوال قانون سورۂ شوریٰ کی آیت ۲۰ میں بیان ہوا ہے:''جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں،اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا ہی میں سے دے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے''۔اسی طرح سورۂ نجم آیت ۳۹۔۴۰ میں بیان کیا گیا ہے ''انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے محنت اور کوشش کی ہے اور یہ کہ اس کی محنت عنقریب دیکھی جائی گی''۔

☆☆☆

❑ تعلیم وتربیت

کثیر لسانی فارمولہ

ابوفہد، نئی دہلی

پڑھنے، پڑھانے کے باب میں شاید سب سے زیادہ اہم اور ضروری چیز زبان ہی ہے اور اس کے باجود ضروری اور اہم ہے کہ زبان کسی بھی علم کو حاصل کرنے یا معلوم شئے کو ظاہر کرنے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ ذرائع اصل نہیں ہوتے وہ ہمیشہ ثانوی حیثیت میں ہوتے ہیں مگر زبان کا معاملہ اِس کلّیہ سے کچھ الگ ہے، کم از کم اِس معنیٰ میں الگ ہے کہ زبان کو محض ایک ذریعہ ہونے کے باوجود بھی اولیت حاصل ہے کیونکہ زبان ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے بغیر ہم کسی بھی کام کو اس کے انجام تک نہیں پہنچا سکتے، بلکہ آغاز بھی نہیں کر سکتے۔ اس کی ہمیں سب سے پہلے مرحلے میں ضرورت ہوتی ہے، یہ زندگی کے ہر موڑ پر ہماری انتہائی ضرورت بن کر ابھرتی ہے، جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں اور جس کا کوئی نعم البدل بھی نہیں۔ قرآن خود اس کی عظمت کا گواہ ہے، قرآن نے اسے انسان کی امتیازی خصوصیات میں بیان کیا ہے۔ سورۂ رحمان میں ہے: ☆الرحمٰن ،علم القرآن ،خلق الانسان ،علمه البیان ☆ ''وہ رحمٰن ہی ہے، جس نے قرآن کی تعلیم دی، انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔''

آج کے دن سے لے کر ماضی کے اُس آخری دن تک چلے جائیں جب زبانوں نے اپنی ترقی یافتہ شکل وصورت حاصل کر لی تھی اور وہ اقوام عالم میں تہذیبی وراثتوں کا قیمتی جوہر قرار پا گئی تھیں، آپ دیکھیں گے کہ اس عرصے میں جتنے بھی اہم لوگ دنیا میں گزرے وہ سب کے سب یا ان میں سے زیادہ تر، کم وبیش پانچ سے آٹھ دس زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں میں کئی تو بے پڑھے لکھے بھی تھے۔ علی میاں ندوی سے لے کر اقبال، ابوالکلام، سید مودودی، سید قطب اور محمد علی جوہر تک اور محمد علی جوہر سے احمد رضا خاں، قاسم نانوتوی، شبلی، سرسید، فضل حق خیر آبادی، شاہ صاحب وابن تیمیہ تک ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد ہیں، ان میں سے کسی کو بھی دیکھ لیں یہ سب کے سب ہفت زباں تھے۔ اور نہ صرف یہ کہ یہ سب ہفت زباں تھے بلکہ بیک وقت ایک سے زائد زبانوں میں اظہارِ خیال کی قدرت بھی رکھتے تھے۔ ایک سے زائد زبانوں میں اظہارِ خیال کی قدرت کا حاصل ہونا ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کرامتیں حاصل ہو جائیں یا پھر ان سے قریب تر حیثیت والی کوئی اور شئے۔

مولانا علی میاں کے تعلق سے یہ کہنا مشکل ہے کہ اردو ان کی مادری زبان تھی یا عربی، انہیں دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی، وہ ان دونوں زبانوں کے علاوہ، انگریزی، ہندی اور فارسی بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ انہوں نے عربی زبان اُسی عمر میں سیکھ لی تھی جس عمر میں دوسرے افراد اپنی مادری زبان سیکھتے ہیں، وہ صرف تیرہ سال کے تھے اور عرب مہمانوں کے ساتھ عربی میں بات کرتے تھے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (1908ء) اردو، فارسی، عربی اور ترکی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی وغیرہ پر بھی عبور رکھتے تھے۔ غالب واقبال نے دو دو زبانوں میں شاعری کی۔ مولانا حمید الدین فراہی کو اردو، عربی، انگریزی، عبرانی اور

سریانی پر بھی عبور صاحل تھا۔عرب کے مشہور ادیب احمد امین کم وبیش پانچ زبانیں جانتے تھے۔اور شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہو کہ انہیں عربی ،فارسی اور انگریزی کے علاوہ اردو اور ہندی بھی اچھی طرح آتی تھیں۔علامہ شبلی کو اردو کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں 'شبلی القلم' ہونا اچھے بھلے قلم کاروں کے لیے بھی بڑے فخر کی بات تھی مگر کم ہی لوگ یہ جانتے ہیں کہ ان کا اشہب قلم عربی میں بھی اسی طرح چلتا بلکہ دوڑتا تھا جس طرح اردو میں دوڑتا اور چلتا تھا۔ سرسید مادری اور مقامی زبان کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی اور روسی بھی جانتے تھے۔مولانا احمد رضا خان تین زبانوں میں شعر کہتے تھے، بلکہ اس وقت کے جتنے بھی شاعر تھے، وہ فارسی اور اردو میں یکساں قدرت رکھتے تھے،اور کئی شاعر بیک وقت کم از کم دو دو زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کو اردو، فارسی اور عربی تین زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ پطرس بخاری (پرفیسر احمد شاہ بخاری)اردو کے علاوہ پشتو، فارسی اور انگریزی بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ ٹیپو سلطان ہفت زبان حکمران کہے جاتے ہیں۔ان کو عربی، فارسی، اردو، فرانسیسی، انگریزی سمیت کئی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔اور طوطیِ ہند امیر خسرو فارسی، اردو، سنسکرت اور پوروی زبان میں شاعری کرتے تھے۔اور ہم جانتے ہیں کہ شاعری آدمی اسی وقت کرسکتا ہے جب اسے اس زبان پر پوری قدرت حاصل ہو۔

یہ تو خیر ماضی کی بات تھی۔ دورِ حاضر میں بھی منبر ومحراب، ادب وصحافت ،صنعت وحرفت،تصنیف وتالیف اور اسپورٹس کے مختلف میدانوں سے وابستہ ہزاروں ایسے افراد مل جائیں گے کہ ان کے تعلق سے ہفت زبانی کی دعویداری ہر طرح سے درست اور مبنی بر حقیقت ہوسکتی ہے۔اگر ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان تمام شخصیات کو عالمی معیار ووقار عطا کرنے میں ان کی خاندانی وجاہتوں،مہارتوں اور کسبی ووہبی صلاحیتوں اور ان تمام علوم وفنون کے علی الرغم جن پر انہیں دسترس حاصل تھی،سب سے زیادہ اور بڑا کردار اگر کسی چیز کا ہے یا ہوسکتا ہے تو وہ ان کی اِسی ایک خصوصیت اور لیاقت کا ہے کہ وہ ہفت لسان تھے۔یقیناً ایسا ہی ہے کہ ہفت لسانی ہمہ دانی سے کہیں بڑھ کر ہے۔اور درست بات تو یہ ہے کہ ہمہ دانی ہر حال میں ہفت لسانی کی مرہونِ منت ہے کیونکہ اِس کے بغیر ہمہ دانی کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

ہر ایک فن اور کسی بھی طرح کی مہارت کا اپنا ایک رعب ہوتا ہے اور ہفت لسان ہونے کا بھی اپنا ایک رعب ہے جو دوسرے کسی بھی فن اور ہنر کے رعب سے کہیں زیادہ بڑا اور با اثر ہے۔ہفت زبان ہونا یعنی کئی زبانیں جاننا آدمی کی راست ترقی کا ذریعہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آدمی خود کو انٹرنیشنل پلیٹ فارم پر متعارف کروانے کا اہل ہوجاتا ہے،امنگیں بڑھتی ہیں اور اس کے مطالعات ،مشاہدات اور تجربات میں توسع، گہرائی اور ہمہ گیری پیدا ہوتی ہے۔صدیوں پر محیط انسانی ارتقاء کا تجربہ اور تجزیہ حقیقی معنیٰ میں وہی لوگ کرسکتے ہیں یا کرتے ہیں جو ایک سے زیادہ زبانیں جانتے ہیں۔جب ہم کوئی زبان سیکھ رہے ہوتے ہیں تو ہم صرف ایک زبان ہی نہیں سیکھتے بلکہ اس کے توسط سے اس سے متعلق ایک پوری تہذیب، ثقافت، تاریخ، ادب اور اہل زبان کی نفسیات اور تاریخی وموروثی خصوصیات سے بھی کما حقہ واقفیت حاصل کرتے ہیں، کم از کم اس وقت جب ہم کسی زبان کو ترجیحی بنیادوں پر سیکھتے ہیں تو ایک نئی زبان کا جاننا محض ایک زبان ہی کا جاننا نہیں ہے بلکہ ایک نئی تہذیب کا جاننا بھی ہے۔

چیکوسلووا کیہ کی ایک مثل ہے: '' Learn a new language and get a new soul''

''ایک نئی زبان سیکھو اور ایک نئی روح حاصل کرو''۔

زبان کا بہت گہرا تعلق انسان کے ذہنی ارتقاء سے ہے۔گرچہ ہفت زبانی بذات خود انسانی ارتقاء کے لئے ضروری نہیں لیکن یہ انسانی ارتقاء کا تجربہ وتجزیہ کرنے کے لیے ضروری ہے۔ڈاکٹر احمد امین نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ'' پہلے میں صرف اپنی مادری زبان عربی ہی جانتا تھا۔مگر اس کے بعد جب میں نے

انگریزی سیکھ لی تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا پہلے میں صرف ایک آنکھ رکھتا تھا اور اب میں دو آنکھ والا ہوگیا ہوں۔ اگر میں صرف اپنی مادری زبان ہی جانتا تو یقیناً معرفت کے بہت سے دروازے مجھ پر بند رہتے۔'' مذکورہ مثال کا زیادہ تر تعلق اندرون ذات سے ہے۔ یہ مثال نئی زبان جاننے کے خارجی عوامل اور فوائد کی طرف اشارہ نہیں کرتی۔ اس لیے یہ مثال نئی زبان کی اہمیت بیان کرنے کے بارے میں آدھی ادھوری وضاحتیں کرتی دکھائی دیتی ہے، پوری نہیں۔ اس مثال میں جو کچھ رہ گیا تھا وہ احمد امین نے بیان کر دیا ہے۔

عموما ہوتا یہی ہے کہ زیادہ تر لوگ مادری زبان کے علاوہ دیگر زبانیں عمر کے درمیانی یا آخری حصے میں سیکھتے ہیں۔ ان کی ضروریات مختلف اور جدا ہوتی ہیں، کچھ لوگ اپنے مطالعے کو وسیع کرنا چاہتے ہیں اور کچھ اپنے کاروبار کو مزید پھیلانا چاہتے ہیں یا پھر بعض دوسرے لوگ کوئی جاب پانے کے لیے زبانیں سیکھتے ہیں۔ وجہ خواہ کوئی بھی ہو ایک سے زائد زبانیں سیکھنا تقریبا ہر کامیاب یا کامیابی کی چاہت رکھنے والے ہر انسان کا اولین کنسرن رہا ہے۔ اور ہر زمانے میں رہا ہے، اور جب زبانیں اتنی ہی ضروری اور اہم ہیں تو اس بات کے لیے کیا امر مانع ہے کہ زبانیں سکھانے کا عمل پرائمری درجات سے ہی شروع کر دینا چاہئے اور اس قدر باقاعدگی اور اہتمام کے ساتھ شروع کر دینا چاہئے کہ اسکول کے طلبہ انٹر تک اور مدارس کے طلبہ عالمیت تک تین سے پانچ زبانیں بحسن وخوبی سیکھ لیں۔ آخر جب زبان کے مقابل کسی حد تک کمتر درجے کے علوم وفنون اور خاص کر ایکٹوٹیز تعلیمی اداروں میں بار پاسکتی ہیں اور اپنے تمام تر طمطراق اور ادائے کج کلاہی کے ساتھ پاسکتی ہیں تو پھر زبانیں کیوں نہیں۔ اور پھر یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ زبانیں سیکھنے کے لیے فراغت کے بعد کا وقت ہی کیوں مختص کیا جائے جبکہ اس قسم کی کوئی بھی چیز جاننے اور سیکھنے کی بہترین عمر یہی بچپن کی عمر ہے۔ نکلتی ہوئی عمر میں حفظ قرآن کی طرح زبانیں سیکھنا بھی زیادہ دشوار ہوتا ہے اور اس کے لیے طویل مدت درکار ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال بھی شاید کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی نوعیت سے ایکسسٹ ضرور کرتا ہے کہ مادری زبان اتنی آسان اور غیر مادری یا غیر ملکی زبان اس قدر مشکل کیوں ہے۔ یہ سوال اکثر طالب علم کرتے ہیں اور اس کا سب سے بہتر جواب یہ ہے کہ زبان کو جو چیز مشکل بناتی ہے وہ بذات خود زبان کا لفظی، صوتی یا اس کا نحوی وصرفی نظام نہیں بلکہ کچھ خارجی عوامل ہیں، جو زبانوں کے سیکھنے کے عمل کے ساتھ ہمیشہ کے لیے لگے ہوئے ہیں۔ ان عوامل میں یہ بھی ایک بڑا عامل ہے کہ آپ کوئی زبان کس عمر میں اور کس ماحول میں سیکھ رہے ہیں اور وہ زبان آپ کی اپنی مادری زبان کے خاندان سے قربتوں اور دوریوں کے تعلق سے کس طرح کی نسبتیں رکھتی ہے۔ جو زبان آپ سیکھنا چاہتے ہیں وہ آپ کی اپنی مادری زبان، اس کی تہذیب اور اس کے نظام حرف وصوت سے اور اس ماحول سے جس میں وہ زبان پل کر جواں ہوئی ہے اور خود آپ پلے بڑھے ہیں اور پڑھے لکھے ہیں، جس قدر مختلف، دور اور غیر مانوس ہوگی، اس کا سیکھنا آپ کے لیے اسی قدر مشکل اور صبر آزما کام ہوگا۔ زبان خواہ کوئی بھی ہو وہ بذات خود مشکل یا آسان نہیں ہوتی بلکہ اس کو خارج کی کچھ دوسری چیزیں مشکل یا پھر آسان بناتی ہیں۔ ایک ہندوستانی کے لیے عربی زبان مشکل ہوگی اور ایک عربی کے لیے ہندوستان کی کوئی بھی زبان ہندی یا اردو اسی طرح مشکل ہوگی، اسی طرح دیگر زبانوں کا معاملہ بھی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ زبانوں کے ساتھ سہل اور مشکل ہونے کی نسبتیں محض ڈرامائی ہیں یا پھر یہ کہ وہ اپنی معنویت میں خارجی اثرات کا دخل رکھتی ہیں۔

یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ طلبہ کا سب سے زیادہ وقت زبانیں سیکھنے پر صرف ہوتا ہے۔ ابتدائی درجات سے لے کر گریجویشن اور پی ایچ ڈی تک بھی بلکہ بے شمار طلبہ اس کے بعد تک بھی زبانیں ہی سیکھتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنی عمر کے اس حصے کو بھی زبانیں سیکھنے پر صرف کر دیتے ہیں جو کسی بھی اکیڈمک پرسنالٹی کے لیے تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدوین کے لیے وقف

ہونا چاہئے۔اور اگر یہ ہمارے تعلیمی اداروں کے سسٹم کی خرابی یا کجی کے باعث ہوتا ہے تو پھر یہ صریح ظلم بھی ہوسکتا ہے۔ اور اگر یہ طالب علم کی اپنی کوتاہی کی وجہ سے ہوتا ہے تو پھر کوئی اِس کا کیا کرے کہ آدمی سب سے زیادہ ظلم خود اپنی ذات پر ہی کرتا ہے۔حتیٰ کہ اس وقت بھی جو وہ بظاہر دوسروں پر ظلم کر رہا ہوتا ہے۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پرائمری اور سکنڈری درجات میں زبانیں سکھانے پر خاطر خواہ توجہ نہیں ہوتی۔ اور زبانیں سیکھنے میں جو کمی رہ جاتی ہے طلبہ اسے اپنے طور پر پرائیویٹ انسٹی ٹیوٹس میں کئی کئی سال کی محنت وکوشش کے ذریعہ پورا کرتے ہیں۔اگر ان کی یہ ضرورت ابتدائی، ثانویہ اور عالیہ درجات ہی میں پوری کردی جائے تو وہ اپنا بہت سارا وقت بچاسکیں گے اور خود زبان سکھانے والے انسٹی ٹیوٹس کی مارامار ی بلکہ مہاری سے بھی محفوظ رکھ سکیں گے۔ جہاں دنیا کی دوسب سے قیمتی چیزیں پیسہ اور وقت کی بربادی کے سوا طلبہ کو مزید کچھ نہیں ملتا۔اور اگر ملتا بھی ہے تو وہ وقت اور پیسے کی ایسی بربادی کی قیمت پر ملتا ہے جس بربادی کا کوئی کفارہ نہیں، نہ شریعت میں نہ فطرت میں۔ میں تو کہتا ہوں کہ کوئی ادارہ، اسکول یا مدرسہ اگر سہہ لسانی یا چار اور پانچ لسانی فارمولے کو ترجیحی طور پر اپنا کنسرن بنالے تو تنہا اسی بنیاد پر وہ اپنی بقا اور زندگی کی دوڑ میں شامل رہنے کا اپنا سا استحقاق حاصل کرلے گا۔

ہندوستان جس طرح مختلف تہذیبوں، مذاہب اور مختلف آب وہوا اور گوناگوں موسموں کا گہوارہ ہے اسی طرح اسے زبانوں کا گھر بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں دنیا بھر کی کل ۶۱۹۲ زندہ زبانوں میں سے ۵۱۴ زندہ زبانیں پائی جاتی ہیں۔اور جب یہ زبانوں کا گھر ہے تو پھر یہ چیز یہاں کے باشندوں کے لئے ہر طرح سے لائق اعتنا ہے کہ وہ مادری اور قومی زبان کے علاوہ دیگر زبانیں بھی سیکھیں۔ اور ایک ہندوستانی مسلمان بچے کو کم از کم پانچ زبانیں سیکھنے کی کوشش کرنا چاہئے، اردو جو اس کی ماردی زبان ہے، ہندی جو اس کی قومی زبان ہے، انگریزی جو انٹرنیشنل لینگویج ہے اور عربی جو اس کی مذہبی یا قرآن وحدیث کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی معیار کی نہایت زرخیز زبان بھی ہے۔

ویسے اس معاملے میں سب سے اچھا اور آسان فارمولہ یہ ہے کہ ہر طالب علم کو کسی ایک زبان پر پوری قدرت حاصل ہو اور وہ اسی کو ذریعہ اظہار کے طور پر اختیار کرے اور ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے مادری زبان سے زیادہ کوئی دوسری زبان موزوں نہیں ہوسکتی۔ اور اگر تمام دنیا کے محققین ومصنفین پر نظر ڈالی جائے تو عموماً ہوتا بھی یہی ہے کہ زیادہ تر اہل علم اپنی مادری زبان کو ہی ذریعہ اظہار کے طور پر چنتے ہیں اور باقی زبانوں کو ثانوی درجے پر رکھ کر انہیں اپنے تحقیقی اور تجزیاتی کاموں کو وسعتیں اور استحکام دینے لیے معاون زبان کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ مادری زبان کی اَولِویت دوہری معنویت کی حامل بھی ہوتی ہے، ایک تو یہی کہ آدمی مادری زبان کے دروبست اور عمق وابعاد کو زیادہ آسانی اور کم سے کم وقت میں جان اور سیکھ سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے اس انتخاب کو اس کی مادری زبان کی جو بسا اوقات اس کی قومی زبان بھی ہوسکتی ہے، براہ راست خدمت کے طور بھی پر دیکھا جاتا ہے۔

ہندوستان کے بیشتر سرکاری تعلیمی ادارے سہہ لسانی فارمولے پر عمل پیرا ہیں۔اور ہر علاقے اور مذہب کو ماننے والے ثانوی درجے کی زبانوں کا انتخاب کرنے میں پوری آزادی بھی رکھتے ہیں۔مگر جن لوگوں کے عزائم بہت بلند ہوں اور جن کی فطرت میں خالق کائنات نے جہاں بینی کی صفت ازل ہی سے رکھ دی ہو، ان کے لئے سہہ لسانی فارمولے کے فریم میں مقید رہنا مشکل ہے۔ان کے لیے اس فارمولے کا ظرف تنگ ہوگا اور وہ زبانِ حال وقال دونوں سے غالب کے طرفدار ہی نظر آئیں گے۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

☆☆☆

❑ تعلیم وتربیت

طلبہ میں مقصدیت کا فقدان، ذمہ دار کون؟

محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی

جو شخص بھی خدا کی قدرت کا منکر نہیں ہے وہ یہ ضرور تسلیم کرے گا کہ اللہ تعالی نے ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی "جوہر" ضرور پوشیدہ رکھا ہے، اور اللہ تعالی یہی چاہتا ہے کہ انسان اپنے اس "جوہر وصلاحیت" کا استعمال کر کے خود بھی اس سے فائدہ اٹھائے اور لوگوں کو بھی فائدہ پہنچائے کہ انسان کی "خیریّت" "نفع رسانی" ہی میں مضمر ہے، اسی کو کہا گیا ہے "خیر الناس من ینفع الناس"

اب سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالی نے ہر انسان کے اندر "جوہر" کا بیج رکھ دیا ہے تو وہ پروان کیسے چڑھے؟ اسے کیونکر "تناور" بلکہ "ثمر آور" درخت بنایا جاسکتا ہے؟

جب اس پہلو سے ہم غور کرتے ہیں تو یہاں ایک "مربی" کا کردار ابھر کر سامنے آتا ہے، اور اس "جوہر" کو نشو ونما دینے میں اساتذہ سمیت والدین اور سرپرستوں کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے ..... کون ذی ہوش یہ تسلیم کرے گا کہ "پودے" کو "درخت" بنانے، یا معمولی سے "پھول" کو خوش رنگ اور خوشبودار بنانے میں ایک باغباں اور مالی کا کوئی کردار نہیں ہوتا؟ پھر انسان تو اس گلشن ہستی کا سب سے حسین پھول ہے، تو کیا اس کی تہذیب اور تراش خراش میں کسی باغباں اور مربی کے دست تربیت کی ضرورت نہیں؟

اب آیئے ذرا اس پہلو پر غور کرلیں کہ آج ہمارے دینی اداروں میں جو طلبا (پھول) نشو ونما اور تعلیم پا رہے ہیں، کیا ان کی اکثریت اپنے مقاصد سے آگاہ ہو پاتی ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟، اس سوال کا جواب اگر آپ چاہتے ہیں تو آپ کو معروف صحافی، اردو اور انگریزی زبان وادب کے صاحب طرز ادیب وماہر انشاپرداز اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اردو آرگن "تعمیر حیات" کے سابق رئیس التحریر مرحوم مولانا امین الدین شجاع الدین صاحب کی یہ چشم کشا تحریر ضرور پڑھنی چاہیے:

"آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے اساتذہ، والدین یا سرپرستوں میں اس درجہ کا احساس اور فکر مندی نہیں دکھائی دیتی اور مطلوبہ فکر مندی کا یہ عملی مظاہرہ دیکھنے کو نہیں ملتا کہ وہ اپنے زیر تربیت بچوں کے اندر خدا کی طرف سے ودیعت کردہ جوہر کا ادراک اور شعور رکھتے ہوں، یا اگر انہیں ان میں موجود جوہر کا احساس وشعور ہو بھی جائے کہ یہ صلاحیت اس بچے میں خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے تو اس جوہر کے پروان چڑھانے کی کوشش وفکر نہیں کی جاتی.....

یہ بات صرف ہم اساتذہ اور والدین کے متعلق اس لیے کہہ رہے ہیں کہ بچے تو بالآخر بچے ہوتے ہیں، بچپن کے مرحلے میں انہیں خدا کی عطا کردہ صلاحیت کا ادراک وشعور کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لیے ذمہ داری بہرحال اساتذہ اور والدین کی ہے، خصوصا اساتذہ کی کہ وہی نئی نسل کے معمار ہوا کرتے ہیں" (نقوش فکر وعمل: ۱۶۹)

اس تحریر کے بین السطور سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ طلبا اپنی "مقصدیت" سے غافل کیوں ہیں؟ اور ان میں "مقصدیت" کیوں کر پیدا نہیں ہو پا رہی ہے؟

جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مدارس کے " خاکستر میں وہ بجلیاں چھپی ہوئی ہیں جو سارے عالم کو تابناک اور درخشاں کرسکتی ہیں "، تو آخر کیا وجہ ہے کہ پہلے کی طرح اب "مدارس" ایسے افراد بہت کم دے رہے ہیں جو دلوں میں ایمان ویقین کی حرارت پیدا کردیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدارس کو کسی کی نظر لگ گئی ہے یا ان پر جمود سا طاری ہوگیا ہے، ایسے میں اگر کوئی خداوندان مکتب سے یہ شکایت کرتا ہے کہ وہ " شاہیں بچوں " کو " خاک بازی " کا سبق دے رہے ہیں تو یہ شکایت بجا نہیں ہے۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ مدارس کا یہ احسان ہے کہ وہ " کندۂ ناتراش " کو کسی " قابل " بنادیتے ہیں، لیکن موجودہ دور تو " جوہر قابل " کی تلاش میں ہے، موجودہ دور ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہمارے مدارس سے اب ایسے طلبہ نکلیں جو دین کے تقاضوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہوسکیں، "علم وفن میں روز بروز جو وسعت، پھیلاؤ اور ترقی ہوتی جارہی ہے اس کا ساتھ دے سکیں"۔

یہ اسی وقت ہوگا جب ہم اپنی کمیاں اور کوتاہیاں دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

وہ کوتاہیاں اور کمیاں کہاں ہیں؟

اب دیکھیے کہ مدارس کے بڑے اجزائے ترکیبی تین ہیں:

۱۔ منتظمین۔

۲۔ اساتذہ ۔

۳۔ طلبہ۔

موجودہ دور میں ان تینوں کی حالت ابتر ہے، ان تینوں پر مختصر تبصرہ کے لیے پڑھیے مرحوم مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کی حقیقت پسندانہ یہ تحریر:

" رہے منتظمین تو انہوں نے مسلمانوں کے اس مقدس اور قیمتی گروہ (اساتذہ برادری) کو اتنا پامال اور بے دست وپا کردیا ہے کہ ان کے پاس عزت نفس اور خودداری نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی، اور نہ جرأت ایمانی اور حق گوئی سے اسے کوئی واسطہ رہا، ان میں ایسی غلامانہ ذہنیت ذمہ داروں کے برتاؤ اور طرز عمل کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے کہ وہ منتظمین کی خوشنودی اور تملق ہی کو اپنا دین وایمان سمجھتے ہیں۔

رہے اساتذہ تو وہ بھی بے گاری کی طرح اپنے مفوضہ کام انجام دیتے ہیں، انہیں طالبعلموں کی تعلیم وتربیت کی مطلق فکر نہیں ہوتی ۔

رہے طلبہ تو ان میں علمی رجحان اور پڑھنے پڑھانے کا ذوق وولولہ کم ہورہا ہے، (ان میں) مطالعہ وکتب بینی میں دل چسپی اور تعلیم کی جانب توجہ ورغبت ختم ہورہی ہے، اور تعلیم میں خلل انداز ہونے والے مشاغل سے دلچسپیاں بڑھ رہی ہیں"۔

(مسلمانوں کی تعلیم: ۸۷۔۸۸)

طلبہ میں مقصدیت کا فقدان کیوں؟

۱۔ طلبہ میں بے مقصدیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ "ناقص الاستعداد "تو کجا "فاقد الاستعداد" طلبہ کو فیل ہونے کے باوجود انہیں ہر سال اگلا درجہ مل جایا کرتا ہے۔ اس پہلو پر توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے، اسلام نے ہر چیز میں " کمیت " سے زیادہ " کیفیت " پر زور دیا ہے، پھر آخر کیا وجہ ہے مدارس میں آج کل "معیار" پر توجہ کم اور "مقدار" پر توجہ زیادہ دی جارہی ہے؟

۲۔ طلبہ کی تعلیم کی طرف سے غفلت کی ایک وجہ بقول مولانا امین الدین شجاع الدین مرحوم یہ بھی ہے کہ "اساتذہ اور نگراں حضرات کی تقرری میں " صلاحیت کے بجائے " تقرب " کا عمل دخل ہے، آج بنیادی مطلوبہ صلاحیت " مفروضہ وفاداری " ہے، وفاداری تو محض ایک حسین عنوان ہے، مگر اس کے پس پشت اپنی خوشامد پسندانہ طبیعت کو تسکین پہنچانا ہے، ورنہ سچی وفاداری سے کسے انکار ہے؟"۔

۳۔ اسی طرح اگر کوئی طالب علم اوپر کے درجوں میں تعلیم سے بددل ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس کی بنیاد کمزور ہے، اور بنیاد کی کمزوری کا سارا دوش طلبا ہی کو نہیں دیا جاسکتا؛ بلکہ بڑی

حدتک اس جرم میں شریک اس کے متعلقہ اساتذہ بھی ہیں جنہوں نے ان کو ابتدائی مرحلوں میں صرف ونحو، انشاء اور عبارت خوانی کے لازمی مراحل کی ہوا بھی لگنے نہ دی۔

۴۔ طلبہ میں بے مقصدیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ والدین اور سرپرستوں کے پاس اپنے بچوں کے لیے بالکل وقت نہیں ہے، ان کی تعلیمی نگرانی اور تربیتی تقاضوں سے غفلت عام ہے، انہیں اس کی مطلق پروا نہیں ہوتی کہ ان کے بچوں نے اخلاقی، تعلیمی اور روحانی ترقی کے کتنے مدارج طے کیے؟ حالانکہ یہ ایسا شدید جرم ہے جس پر وہ عنداللہ مسئول وماخوذ ہوں گے، درحقیقت ایسے ماں باپ "قاتل" ہیں، جنہوں نے جسم کو تو باقی رکھا اور روح واخلاق کو قتل کر کے رکھ دیا۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح آج ہمیں طلبہ میں بے مقصدیت کا شکوہ ہے، اسی طرح کا گلہ طلبہ کو بھی ہے کہ ہمارے اساتذہ اپنی "مفوضہ ذمہ داریاں" نبھانے میں امانت دار نہیں ہیں:

'الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔

وہ فرض جو مدارس کے ذمہ ابھی باقی ہے :

۱۔ دعوت دین کے لیے داعیوں کی تیاری کا مسئلہ ہے۔

۲۔ اسلام سے متعلق پھیلائی جارہی غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے رسوخ فی العلم اور تفقہ فی الدین کے حامل متکلمین کی تیاری کا مسئلہ ہے۔

۳۔ مدارس میں اہل ولائق مدرسین اور مربیوں کی فراہمی کا مسئلہ ہے۔

۴۔ صحافت کے میدان میں اسلامی ذہن رکھنے والے صحافیوں کی تیاری کا مسئلہ ہے۔

۵۔ عربی وانگریزی اور دیگر زبانوں میں حالات حاضرہ کے پیش نظر اسلامی کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے کا مسئلہ ہے۔

۶۔ ایسے داعی، نیز صاحب قلم علماء کی تیاری کا مسئلہ ہے جو بیک وقت عربی، انگریزی اور مادری زبان پر عبور رکھتے ہوں، اور اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی قدرت وصلاحیت رکھتے ہوں۔

۷۔ دارالقضاء کے نظام کو چلانے کے لیے اچھے قاضیوں کی تیاری کا مسئلہ ہے۔

۸۔ قدیم صالح اور جدید نافع کے امتزاج کو اب بھی شرمندۂ تعبیر ہونا باقی ہے۔(نقوش فکر وعمل:۱۶۶-۱۶۷)

ایک آخری گزارش یاعاجزانہ درخواست :

ان تقاضوں کے پیش نظر اب مدارس کو محض "خانہ پری" کے بجائے سنجیدہ، ٹھوس اور نتیجہ خیز کوششوں کو تیز کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

''اس لیے ہماری گزارش قوم کے ارباب حل وعقد سے بس اتنی ہے کہ یہ بات اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھالیں کہ "مدارس سنگ وخشت اور بلند وبالا اور خوش نما عمارتوں کا نام نہیں ہیں کہ ان میں مسابقت کی جائے، ان کا اصل سرمایہ طلبہ واساتذہ ہیں، ان کی دینی روح اور سیرت وکردار کا جوہر ہی مدرسہ کو رنگ وروغن بخش سکتا ہے، اس لیے سارا زور طلبہ کو سنوارنے، ان کی سیرت وکردار کی تعمیر وتشکیل اور لائق وذی استعداد اساتذہ ومعلمین کی فراہمی پر صرف کرنا چاہیے"(مسلمانوں کی تعلیم:۸۰)۔

اس لیے ضرورت ہے کہ بہت جلد ان کوتاہیوں کی تلافی کی جائے، اس سلسلے میں چشم پوشی اور اغماض خطرناک نتائج پیدا کرسکتا ہے؛ اس لیے کہ:

فطرت افراد سے اغماض بھی کرلیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اس لیے:

معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

☆☆☆

❑ عالم اسلام

فتح اللہ گولن اور پاک ترک انٹرنیشنل اسکولز اینڈ کالجز

ڈاکٹر عرفان شہزاد

پاک ترک انٹرنیشنل اسکولز اینڈ کالجز نے اپنے آفیشل ویب پیج پر اپنی تعلیمی تنظیم کے بانی اور سرپرست، فتح اللہ گولن سے اعلانِ برات کر دیا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح مفتی حنیف قریشی نے ممتاز قادری سے اعلان برات کر دیا تھا۔ پاک ترک انٹرنیشنل اسلامی تشخص رکھتا ہے اور پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد اپنے بچوں کو ملک کے ان مہنگے ترین اسکولوں میں اسی لیے داخل کرواتے ہیں کہ ان کے بچوں کی اسلامی اصولوں پر اخلاقی تربیت کا محرک بھی پاک ترک انٹرنیشنل نے انہیں دے رکھا ہے۔ پاک ترک انٹرنیشنل کا یہ بیان کہ فتح اللہ گولن سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، ایک سفید جھوٹ ہے جو ان کے اسلامی تشخص پر ایک بڑا سوالیہ نشان کھڑا کر دیتا ہے۔ ان کے اسلامی اخلاق اور اسلامی بھائی چارہ کے معیار پر اور بھی بہت سے سوالیہ نشان موجود ہیں۔

مجھے ایک سال فتح اللہ گولن کی قائم کردہ اس تعلیمی تنظیم، پاک ترک انٹرنیشنل سکولز اور کالجز، میں کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ تنظیم گولن صاحب کے مریدین اور متعلقین پر مشتمل ہے۔ البتہ گولن صاحب کے ان مریدین کی ذہنی اور اخلاقی حالت انتہائی خستہ ہے، جس کا ایک مظاہرہ ان کا گولن صاحب سے حالیہ اعلان برات ہے۔

اسلام اور اسلامی بھائی چارہ کے نام پر یہ درحقیقت وہی سرمایہ دارانہ بے حسی اور منافع خوری کا کھیل ہے جو دوسرے لوگ اسلام کا نام استعمال کئے بنا کھیل رہے ہیں۔ ان کا سارا اخلاق خوش اخلاقی تک محدود ہے۔ اس سے باہر یہ ایک مکمل دنیاداروں کا ٹولہ ہے جس نے دینی لبادہ اوڑھ رکھا ہے، اور شاید خود فریبی میں بھی مبتلا ہے۔

اپنے عملے اور طلباء میں یہ گولن صاحب کی ترجمہ شدہ کتب اور ان کی تنظیم، خدمت مومنٹ (ہزمت مومنٹ) کا لٹریچر تقسیم کرتے ہیں۔ طیب اردگان کے خلاف جہاں بیٹھتے ہیں پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ طلباء کی تربیت کے نام پر جو کلاسیں یہ لیتے ہیں اس میں بھی طیب اردگان کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں۔ طلباء ہمارے پاس آ کر شکایت کرتے تھے کہ یہ طیب اردگان کے خلاف ہمارے ذہنوں میں نفرت کیوں ڈالتے ہیں۔ ہم نے بھی ایک بار اعتراض کیا کہ تعلیم سے سیاست کو دور رکھا جائے اور طلباء کو ان باتوں میں نہ الجھایا جائے، لیکن ایک ترک دوست سے یہ جواب ملا کہ ان کا اصل مقصد تبلیغِ دین (ان کا اپنا تصورِ دین) ہے، تعلیم تو اس کام کے کرنے کا ایک ذریعہ ہے، اور وہ ذریعہ پر مقصد کو قربان نہیں کر سکتے۔

اپنے حالیہ اعلامیہ میں ایک جھوٹ اور بھی انہوں نے شائع کیا ہے کہ ان کی تعلیمی تنظیم کا مقصد غریب اور محروم بچوں تک اعلیٰ تعلیم کی سہولیات فراہم کرنا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ پاک ترک انٹرنیشنل، پاکستان میں مہنگا ترین تعلیمی ادارہ ہے۔ چند غریب اور مستحق بچوں کو یہ لوگ وظائف بھی دیتے ہیں، لیکن صرف اس لیے کہ دکھا سکیں کہ غریب اور مستحق بچوں کو بھی بغیر فیس کے یا رعایتی فیس پر تعلیم دی جا رہی ہے لیکن ان رعایتی فیس والوں کا تناسب بمشکل ایک فیصد بھی نہیں ہوگا۔ سارے سکول ایلیٹ کلاس کے بچوں پر مشتمل ہیں۔

بیکن ہاوس اور سٹی اسکول جیسے اداروں کے مقابلے میں یہ دگنی فیس وصول کرتے ہیں۔ اتنی گراں فیس وصول کرنے کے باوجود تمام طلباء کے کمروں میں اے سی بھی نہیں لگوائے گئے ہیں۔ جن کمروں میں لگے ہوئے بھی ہیں ان میں سے بہت سے درست کام نہیں کرتے۔ البتہ جس کمرے میں پرنسپل صاحب کا بیٹا پڑھتا تھا اس کا اے سی کبھی خراب نہیں ہوا۔ اسی طرح اپنے بروشرز میں یہ دکھاتے ہیں کہ ہر کمرے میں سمارٹ بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک دو کمروں کے علاوہ سمارٹ بورڈ اکثر خراب پڑے رہتے تھے اور ہم وائٹ بورڈ پر ہی کام کروایا کرتے تھے۔

ایک اور حقیقت یہ ہے کہ پاک ترک کے ''اسلامی اسکول'' نے دیگر ''سیکولر اسکولوں'' کی طرح سی ڈی اے سے اپنی عمارتوں کے لئے اسلام آباد میں جو زمینیں حاصل کی ہیں، وہ مشرف دور کی بندر بانٹ میں حاصل کی گئی ہیں۔ 100 روپے سے 500 روپے فی اسکوئیر گز کے حساب سے چک شہزاد، ایچ ایٹ اور دیگر پوش علاقوں کے پلاٹ مختلف اداروں اور سکولوں کو دیئے گئے تھے۔ اس بندر باٹ میں پاک ترک انٹرنیشنل نے بھی اپنا حصہ وصول کیا اور اس میں ان کے ''اسلامی ضمیر'' نے بھی ان کو بالکل تنگ نہیں کیا، یا شاید انہوں نے اسے فی الدنیا حسنۃ کے کھاتے میں ڈال کر اپنے ضمیر کو مطمئن کرلیا ہوگا۔ اس پر ایک صحافی نے ٹی وی کے ایک چینل پر باقاعدہ ایک پروگرام کیا تھا لیکن باوجود تلاش کے مجھے ملا نہیں۔

اسکول کی انتظامیہ اپنے ملازمین خصوصا پاکستانی ملازمین کے لیے انتہا درجے کی بے حس واقع ہوئی ہے۔ ملازمین کے لیے تنخواہ کے علاوہ جاب سیکیورٹی، ہیلتھ انشورنس، قرضہ جات کی سہولت، پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ کا کوئی انتظام نہیں۔ بارہا اس پر توجہ دلائی گئی مگر جواب ندارد۔

طلبا کی فیس مارکیٹ سے زیادہ ہونے کے باوجود اساتذہ کی تنخواہیں، سوائے چند سینئر اساتذہ کے، مارکیٹ سے بہت کم ہیں۔ اساتذہ کو اپنی گاڑیاں، بائیک اپنے رِسک پر اسکول کی عمارت سے باہر پارک کرنے پڑتے ہیں جن کے لیے باوجود بار بار کے مطالبے کے کوئی شلٹر یا شیڈ تک نہیں بنوائے گئے۔ دھوپ میں یہ گاڑیاں اور بائیک بہت گرم ہوجاتے ہیں اور بارش میں موٹر سائکلوں میں پانی چلا جاتا ہے۔ سٹارٹ کرنے میں نہایت دشواری ہوتی تھی۔ لیکن انتظامیہ نے 60 لاکھ کی خطیر رقم سے سکول میں اپنے من پسند کھیل، فٹ بال کے لیے گراؤنڈ بنوانا تو پسند کیا لیکن اساتذہ کی گاڑیوں اور بائیک کے لیے چند ہزار روپوں سے شلٹر بنوانا گوارہ نہ کیا۔

ترکی سے درآمد کیے ہوئے جتنے بھی اساتذہ ہم نے دیکھے، سب بے حد نالائق تھے۔ طلباء کی پے در پے تحریری شکایتوں کے باوجود بھی ان کو کبھی نہیں نکالا گیا، لیکن پاکستانی اساتذہ کو معمولی شکایتوں پر بھی نکال دیا جاتا یا وارننگ کے ساتھ وضاحتیں دینے کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔

دیگر سرمایہ دارانہ اسکولوں کی طرح یہاں بھی بچوں اور ان کے والدین کو بطورِ گاہک دیکھا جاتا ہے۔ گاہک کو ناراض نہ کرنا سرمایہ دار کا بنیادی اصول ہوتا ہے۔ ہمارے ایک انتظامی افسر کی غیر موجودگی میں ایک طالب علم دھڑلے سے اس کی کرسی پر جا بیٹھا اور کمپیوٹر سے کھیلنے لگا۔ اس نے جب دیکھا تو ایک تھپڑ جڑ دیا۔ اگلے دن ہی ان صاحب کو ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ لیکن ایک طالب علم نے راہداری میں کھڑے ہوکر ایک استاد کو گالیاں دیں، لیکن اس کا کیس، ایک انتظامی کمیٹی سے دوسری انتظامی کمیٹی، وہاں سے صدر دفتر کے درمیان چکر کھاتا رہا لیکن طالب علم، آخری خبریں آنے تک، نکالا نہیں گیا۔

ہمارے ایک کولیگ کا کاندھا ایک حادثے میں ٹوٹ گیا۔ ڈاکٹر نے دو ماہ کا آرام لکھ دیا۔ لیکن جب اس کا وائس پرنسپل اسے دیکھنے ہسپتال گیا تو اس نے اپنا کاندھا ڈھانک لیا اور ڈاکٹر کو منع کر دیا کہ اسے کچھ نہ بتائے، اور چھٹے دن وہ نوکری پر آ گیا۔ اسے ان ترکوں کے مزاج کا اندازہ تھا جو بات بات پر ملازمت سے فارغ کر دیتے تھے۔ (اردگان کی مثال ہی دیکھ لیجئے، ہزاروں لوگوں کو نکال چکا

ہے، ترکوں کا یہی مزاج ہے) بعد میں اس نے موقع آنے پر انہیں یہ جتلا بھی دیا کہ وہ ملازمت چلے جانے کے ڈر سے ٹوٹی بازو کے ساتھ نوکری پر آیا تھا، اس پر وہ کھسیانے ہو کر کہنے لگے کہ آپ رخصت لے لیں، لیکن اس نے نہیں لی۔ اس کے برعکس مجھے مسیحی مشنری ادارے، سینٹ میریز میں کام کے دوران حادثہ پیش آیا تھا، میرا پاؤں ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن ادارے نے بغیر کسی معاہدے یا میرے مطالبے کے مجھے دو ماہ گھر بیٹھے تنخواہ دی تھی، اور نوکری بھی سلامت رہی۔ (میں نے بھی یہ بات ایسے ہی پاک ترک انٹرنیشنل کو جتلا دی تھی۔) لیکن اسلامی مشنری ادارے کا یہ حال کہ اس کے زخمی مسلم ملازم کو ان پر اتنا بھی اعتماد نہ تھا کہ وہ اس کی نوکری بھی سلامت رہنے دیں گے یا نہیں۔

ایک اور غلط پالیسی ان کا ہفتہ کے دن کو بھی اساتذہ کے لیے مستقل آنا رکھنا ہے، جب کہ اس کا بھی کوئی واضح مقصد نہیں ہے۔ کہنے کو یہ دن سیکشن اور جنرل میٹنگز کرنے کے لیے ہوتا ہے تاکہ آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کیا جائے، لیکن درحقیقت قابلِ بحث باتیں ہر ہفتے اکثر ہوتی ہی نہیں، جو کام دس پندرہ منٹ کی میٹنگ میں ہوسکتا تھا اس کے لیے یہ اساتذہ کا پورا دن برباد کرتے ہیں۔ اساتذہ کے لیے یہ کتنی ذہنی کوفت کا سبب ہے اس کا اندازہ ایک استاد ہی لگا سکتا ہے۔ ویک اینڈ پر ایک دن گھر والوں کو دے کر، ذہنی سکون حاصل کر کے، دوسرے دن اساتذہ اپنے ہفتہ بھر کے اسباق کا منصوبہ تیار کرتے ہیں، لیکن ایک دن کی چھٹی میں ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ ہر جگہ دو دن کا ویک اینڈ ہوتا ہے، رشتہ دار اسی حساب سے ملنا جلنا طے کرتے ہیں، لیکن ایک دن چھٹی کرنے والے خاندان سے کٹ کر رہ جاتے ہیں۔ جن ملازمین کا گھر شہر سے باہر ہوتا ہے وہ اگر دو دن کی چھٹی ہو تو گھر سے ہو آتے ہیں، لیکن ایک دن چھٹی کی وجہ سے وہ گھروں کو بھی نہیں جا پاتے، یوں وہ ذہنی سکون سے محروم ہی چلے آتے ہیں، جس سے ان کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ اور اگر یہ ایک دن کی قربانی کسی مقصد سے بھی ہوتی تو گوارا کی جاسکتی تھی لیکن ہوتا یہ ہے کہ پرنسپل صاحب جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا، بائیو میٹرک سسٹم کے تحت حاضری لگوا کر آنے کے باوجود، جنرل میٹنگ میں ایک کاغذ پر سب کی حاضری لیتے۔ جب سو کے قریب لوگ حاضری دے لیتے جس میں آدھا وقت بخوبی گزر جاتا تو اس کے بعد وہ ہمیں بتاتے کہ وقت پر کلاس میں جانا چاہئے، بچوں کو ڈانٹنا نہیں چاہئے، وغیرہ وغیرہ۔ ایم اے، ایم فل کیے ہوئے ذہین لوگ یہ باتیں سننے کے لیے مجبور ہوئے اپنی قسمت کو کوستے ہوئے یہ سب سنتے رہتے۔ یوں بھی ہوتا کہ اساتذہ ہفتے کو آتے، اور پرنسپل صاحب نہ ہوتے تو ہم سے کہا جاتا کہ سب قرآن لے کر بیٹھ جائیں اور ثواب کمائیں۔ ہفتے کے اس بے فائدہ دن پر بھی چھٹی حاصل کرنا جوئے شیر لانے یا شیر کے منہ سے نوالہ چھیننے کے برابر ہوتا ہے۔

ہاسٹل کے طلباء کا کم قیمت کم معیاری کھانا ایک مستقل شکایت ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ ناشتے میں روٹی کے سوکھے ٹکڑے تک دیے جاتے ہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے اگر ایسا ہی ہے تو ان طلبا کے والدین اتنی مہنگی فیسیں دینے کے بعد یہ سب کیوں برداشت کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان اسکولوں کا بظاہر دینی ماحول ہے۔ والدین بچوں کو معیاری تعلیم بھی دلوانا چاہتے ہیں اور ان کی اخلاقی تربیت کے لئے بھی فکر مند ہیں۔ بیکن ہاؤس، سٹی سکول، روٹس، فروبلز وغیرہ جو آزادانہ بلکہ بدتمیزانہ قسم کا کلچر فروغ دے رہے ہیں اس سے بچنے کے لیے والدین ان منافقانہ دین دار سرمایہ داروں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اس میں ان مادر پدر آزاد کلچر پھیلانے والے اسکولوں کے لیے بھی سبق ہے کہ وہ بھی اگر، کاروباری نقطہ نظر ہی سے سہی، اپنے ہاں بھی اخلاقی تربیت کا عنصر شامل کر لیں تو پاکستانی والدین کی زیادہ بڑی تعداد کو اپنا گاہک پائیں گے۔

☆☆☆

❑ عالم اسلام

مسلمانانِ ’’برما‘‘ وحشیانہ ضربوں کے سایہ میں

کفیل احمد ندوی، مرادآبادی
استاد حدیث وفقہ: مدرسہ کاشف العلوم، (بریلی)

آج پورے برما خصوصا اس کے صوبے راکھین (ارکان) میں مسلمانوں کا وجود خطرے میں ہے۔ جنونی بودھوں کی طرف سے ان کو زبردست خطرات کا سامنا ہے۔ چونکہ راکھین (ارکان) ہی سے پورے برما میں اسلام پھیلا، اس لئے یہاں کے مسلمانوں کے روشن ماضی اور انکی تہذیب وثقافت اور انکو درپیش مصائب ومسائل کا ایک جائزہ پیش خدمت ہے۔

برما کے جغرافیائی حالات:

موجودہ متحدہ برما کے تین طرف خشکی اور ایک طرف سمندر ہے، یہ خلیج بنگال کے ساحل پر واقع ہے، مشرق میں چین وتھائی لینڈ، مغرب میں ہندوستان و بنگلہ دیش، شمال میں کوہ ہمالیہ کا سلسلہ، اور جنوب میں سیام وملایا اور بحر ہند ہیں، سرکاری زبان برمی، اکثریت بودھوں کی ہے، ہندو، مسلمان اقلیت میں ہیں، برما کے مغربی حصہ میں مسلم اکثریتی صوبہ ارکان (راکھین) واقع ہے، برما کا دارالحکومت رنگون ہے۔

مشرق وسطیٰ اور عرب سے تعلقات:

ارکان کے تعلقات مشرقِ وسطی اور عربوں سے زمانہ جاہلیت سے رہے ہیں، ارکان کے راجے کسریٰ کے پاس تحائف وہدایا بھیجا کرتے تھے، اور خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا، اسی طرح ارکان کے راجوں نے مسلم حکمرانوں، اموی وعباسی خلفاء سے سیاسی سیاحتی ومعاشی تعلقات قائم کر لئے تھے، قیمتی ہدایا وتحائف کا تبادلہ ہوا کرتا تھا، عمر بن عبدالعزیز کے نام ایک خط کا علم ہوتا ہے، اور خلیفہ المامون کے نام بھی ایک خط کا علم ہوتا ہے جس میں المامون سے ایک جید عالم وداعی کو بھیجنے کی درخواست تھی، المامون نے بھی جوابی خط لکھا تھا۔

ارکان میں اسلام کی آمد:

ارکان میں اسلام 610ء سے 660ء کے درمیانی وقفہ میں پھیلا، 680ء کو عرب تاجروں کے ارکان آنے کا ذکر ملتا ہے۔ 780ء کو عرب تاجروں کی ایک بڑی تعداد ارکان آئی تھی اور جب 788ء کو عرب تاجروں کے جہاز ساحلِ ارکان پر غرق ہو گئے تھے تو ان کے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لینے کے بھی ثبوت موجود ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ہی عرب تجار کے ذریعہ ارکان میں اسلام پھیل چکا تھا، یہاں کے باشندے نرم مزاج ومہمان نواز تھے، عربوں کا غلبہ بحریہ پر قائم ہو چکا تھا، یہ جہاں جاتے اسلام پھیلاتے، مقامی آبادیوں میں گھل مل جاتے، اور شادیاں کر لیتے تھے، مستدرک حاکم جلد 4 ص 35 میں ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ ارکان کے راجہ نے زنجبیل آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجی تھی، آپ ﷺ نے خود بھی کھائی اور صحابہ کو بھی کھلائی۔

ارکان کی تحقیق:

اراکنہ ارکون کی جمع ہے، اس کے معنی رئیس وسردار کے ہیں، اسی سے ارکان نام بن گیا، یا پھر یہ رکن جمع ارکان سے بنا ہے۔ جس کے

معنی اسلامی فرائض کے ہیں،یعنی یہاں کے راجہ کے قبولِ اسلام کے بعد اسلام کے ارکان اربعہ پر عمل کی وجہ سے سلطنت کا نام ارکان رکھدیا گیا،اب یہاں کے مسلمان اپنے کو ارکانی ہی کہلائے جانا پسند کرتے ہیں، برمی یا روھنگی مسلمان کہلائے جانے کو ناپسند کرتے ہیں،اب ارکان کو راکھین کہا جارہا ہے،یہ بھی مسلمانوں کو انکے ماضی سے کاٹنے کی ایک سازش ہے۔

روھنگیا کی تحقیق:

رہم، رحمۃ یا رھام ارکان کا قدیم نام ہے،اسکے معنی مسلسل ہلکی بارش کے ہیں،کوفہ کے ایک نزدیکی علاقہ کا نام بھی روحیمۃ ہے اور یہ رحمۃ کی تصغیر ہے،کوفہ کے اس علاقہ کی وجہ تسمیہ پر قیاس کرتے ہوئے ارکان کا نام رحمتہ رکھنا کچھ بعید نہیں ،اب اس سے روہانی یا روہنگی ہے۔یعنی روہنگ کے قدیم باشندے جو اکثر مسلمان ہیں۔

ارکان میں بودھ

مگدھ بہار کو کہتے ہیں ، بہار کے بودھ ۱۲ رویں صدی میں برما آکر بسے تھے،ہم مذہب وثقافت ہونے کی وجہ سے برمیوں نے انکو اپنے اندر ضم کرلیا،اور پھر یہ دھیرے دھیرے اتنے پھیلے کہ ارکان میں بھی آباد ہوگئے،جبکہ ارکان میں مسلمان مگدھ بودھوں سے بہت پہلے آباد ہو چکے تھے۔

ارکان کی اسلامی حکومت

ارکان پر مسلمانوں کی حکومت چار سو سال تک بڑے ہی شان و شوکت، طاقت وقوت، تہذیب وتمدن کے ساتھ قائم رہی ، یہ حکومت مسلسل ترقی کے مدارج طے کرتی رہی ، درمیان میں سخت مراحل بھی آتے رہے جن کو ناکام بنایا جاتا رہا،لیکن آخر میں اس اسلامی حکومت کا چراغ گل کردیا گیا اور مسلمانوں پر مظالم کا دور شروع ہوگیا، 725 سے ارکان کے جزیرے پر مسلمانوں کی حکومت کا پتہ چلتا ہے 825ء سے 837 ء تک شیخ عبداللہ نے یہاں حکومت کی یہاں مسلمانوں کی منظّم حکومت 430ء میں قائم ہوکر 1784ء تک 354 سال تک رہی۔

برما کا قبضہ و مظالم:

1404ء کو برمی راجہ من کھامن نے ارکان پر قبضہ کے بعد مسلمانوں کا قتل عام کیا،مسلمانوں کو قید کرکے اپنے ساتھ لے گیا، سلمان شاہ نے بنگال میں پناہ لی ۔1430ء کو بنگال کے حاکم ناصر شاہ نے اپنے سپہ سالار ولی خان کی قیادت میں چالیس ہزار غوری فوج سلمان شاہ کا تخت واپس دلانے کے لئے روانہ کی۔جس میں کامیابی حاصل ہوئی ۔سلمان شاہ اس سلطنت کے پہلے بادشاہ تھے جنہوں نے 1430ء تک حکومت کی،1415ء میں پرتگیزیوں کے حملے کو ناکام بنایا گیا۔

مسلم دورِ حکومت کا خاتمہ:

مسلمان 1784ء تک حاکم رہے 1784ء کو ایک بار پھر برمی راجہ بودھیہ نے ارکان پر 20 ہزار فوج 2 ہزار گھوڑوں 200 ہاتھیوں کے ساتھ حملہ بول دیا۔لنگریٹ کے مقابلے میں مسلمانوں کو شکست ہوئی،اس راجہ نے بہت زیادہ ظلم کیا،عصمتوں کو تارتار کیا، اسلامی سرکاری لائبریریوں،کتب خانوں کی ہزاروں کتابوں کو جلوا دیا،اس کے بعد برمی راجے جب چاہتے مسلمانوں کو پکڑ کر لے جاتے ،تعمیری کام کرواتے ،سختیاں کرتے ،مرتد بناتے، 1784ء میں ہزاروں ارکانی مسلمانوں کو برما لے جایا گیا ،1790ء میں جب پھر دو ہزار لوگوں کو لے جایا جانے لگا تو مسلمانوں نے زبردست احتجاج کیا اور جہاد شروع کیا، بہت سارے مسلمان بنگلہ دیش، چاٹ گام ہجرت کر گئے۔

انگریزوں کے قبضے کے بعد :

1825 کو انگریزوں نے پہلے ارکان پھر پورے برما پر قبضہ کرلیا،1948 کو برما آزاد ہوا، جنگ عظیم ثانی میں انگریزوں کی حالت بہت کمزور تھی،ان کے اتحاد کو خطرہ تھا،انگریز نے ارکان کے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ اگر ہمارا ساتھ دیا تو آزادی دی جائے گی،اور پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے یا الگ ملک بسانے کا اختیار ہوگا، معاہدہ کے بعد مسلمانان ارکان نے برطانوی فوج کو ارکان

میں داخل ہونے کی اجازت دی۔لیکن جاپانیوں اور مگدھ بودھوں کی سازش اور برطانیہ کی مجرمانہ خاموشی سے ایک لاکھ مسلمان شہید کردیے گئے، پانچ لاکھ ہجرت پر مجبور ہوئے، 307 دیہات تباہ کردیئے گئے۔حسب وعدہ برطانیہ کو وعدہ پورا کرنا تھا،لیکن جب مسلمانوں کے تعاون سے ملک آزاد ہوا تو ارکان کو جبراً برما میں ضم کردیا، اورارکانیوں کے حقوق سلب کر لیئے گئے۔اگرچہ مسلمانوں نے مشرقی پاکستان کے ساتھ الحاق کی کوششیں کیں،لیکن کشمیر کی طرح مسئلہ کو معلق رکھا گیا، 1960ء میں برما میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی جس نے تمام مظالم کی انتہا کردی اور پڑوسی ملکوں کی طرف مسلمانوں کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔

ارکانی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت:

۱۔ ارکان (راکھین) میں مسلمان اکثریت میں ہیں، باقی پورے برما کا بیس فیصد ہیں،موجودہ برما کے مسلمان عرب بھی ہیں اور مغلی غوری بھی لیکن سب میں تمیز کرنا مشکل ہے۔

۲۔مسلم دورِحکومت میں اسلام کا غلغلہ تھا،شریعت اسلامی کا نفاذ تھا ،قضاۃ مقرر تھے،مساجد و مدارس آباد تھے، عالم عرب سے بھی اچھے تعلقات تھے،ارکانی بادشاہ اپنے سکوں پر محمد اور اللہ کندہ کرواتے تھے، ارکانی سلطنت بہت وسیع ہوگئی تھی،لوگوں کا تعلق اسلام سے مضبوط تھا ،اس دور میں بہترین ادبی،دینی،مذہبی،ثقافتی لٹریچر تیار ہوا۔

برما کے موجودہ حالات:

۱۔ راکھین کے مسلمانوں کو دہشت گرد،شدت پسند،جنونی بودھوں سے زبردست جانی،مالی،معاشی خطرات کا سامنا ہے۔

۲۔ آئے دن مسلمانوں کے مجمعوں ،مدارس و مساجد پر غیر معمولی مسلح حملے ہوتے ہیں۔

۳۔ برما کی موجودہ حکومت مسلمانوں کو ملک کا شہری نہیں مانتی ، 1982ء سے نیا سٹیزن شپ قانون نافذ ہے ،کہ روہنگیا مسلمان شہریت کے حقدار نہیں، یہ غیر ملکی ہیں،ان کو ملک سے نکال دیا جائے،یا غیر ملکیوں کی طرح اجازت نامہ لے کر رہیں۔

۴۔ موجود حکومت مسلمانوں پر بہت سختی کرتی ہے، انسانی حقوق سے بھی محروم کردیا ہے، شادی اور بچوں کی کثرت پر بھی پابندیاں ہیں۔

۵۔ یہاں کے مسلمان اپنے دین سے بھی دور ہو چکے ہیں، عالم اسلام سے ان کے تعلقات بہت کمزور ہیں،وہ صرف ایک زبان روہنگیا سے واقف ہیں جس کی وجہ سے بہت سارے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

۶۔ برما کے مسلمان خصوصاً جدید نسل کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی روشن تاریخ،تہذیب وتمدن وثقافت،اور اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناواقف ہے۔

برما کے مسلمانوں پر ظلم وستم کی یہ داستان بہت طویل ہے،جس کا نیا سلسلہ تین چار سال پہلے سے شروع ہوا ہے، جواب اپنی انتہا پر پہنچ چکا ہے،قتل عام جاری ہے،عصمتوں کو لوٹا جارہا ہے،مسلمانوں کا تعاقب کیا جارہا ہے،بچوں بوڑھوں،عورتوں کو آگ کے حوالے کیا جارہا ہے، اور یہ سب ان بودھوں کی طرف سے ہورہا ہے جو عدم تشدد کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

اس لئے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ برما میں اسلام کی اشاعت وحفاظت کا کام کیا جائے،اور یہاں کی آبادی کو اسلام سے متعارف اور مسلمانوں سے مانوس کیا جائے ، اور عالم اسلام کی طرف سے یہاں دعوتی مہم شروع کی جائے، برما کے مسلمانوں کی کسمپرسی، ان کے خلاف کئے جانے والے امتیازی سلوک کے تدارک،اور مظالم کے خاتمہ،اور بدترین قتلِ عام کو روکنے کے لئے مسلمانانِ عالم کو فوری مؤثر ومنظّم کردار ادا کرنا چاہیے۔اس حوالے سے امن و انسانیت کے نام نہاد علمبرداروں ،حقوق انسانی کے جھوٹے بے بس محافظ ادارے اقوام متحدہ سے کسی بھی طرح کی امید رکھنا فضول ہے۔

☆☆☆

❑ زبان و تہذیب

الفاظ کا جادو

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

نوٹ: عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی کی طرح ہماری صحافتی زبان اور اردو کے رسائل میں بھی درست زبان کی طرف توجہ کم دی جاتی ہے، اپنی زبان میں جب تک ولایتی کے کچھ الفاظ زبردستی داخل نہ کیے جائیں تب تک کام نہیں چلتا، بلکہ بسا اوقات بہت سے لوگوں کو اس طرز عمل کے بغیر اپنے پڑھے لکھے ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا، زبان کا بڑا گہرا اور نازک رشتہ تہذیب سے ہوتا ہے، ہماری اردو زبان ہماری مشرقی تہذیب کی امین و آئینہ دار رہی ہے، لیکن درست زبان پر توجہ نہ دینے اور اردو میں ولایتی یا دیگر زبانوں کو بالجبر داخل کرنے سے ہماری تہذیب بھی متاثر ہوئی ہے۔ یہ اصول تسلیم شدہ ہے کہ کسی قوم پر غلبہ پانے کے لئے سب سے پہلے اس کی زبان پر حملہ کیا جاتا ہے، جب زبان پر سے قوم کا اعتماد اٹھ جاتا ہے تو پھر وہ اپنی تہذیب کے سلسلہ میں بھی احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے، اس طرح وہ رفتہ رفتہ اپنی تاریخ و تہذیب سے لاتعلق ہو کر رہ جاتی ہے۔

''ندائے اعتدال'' میں ''زبان و تہذیب'' کا یہ کالم اسی مقصد سے شروع کیا جا رہا ہے کہ اس میں ایسے مضامین شائع کیے جائیں جن سے ایک طرف زبان کی صحت آشکارا ہو اور دوسری طرف ہمارے تہذیبی رشتہ کے عکاسی ہو، اس کالم کی تیاری جناب محمد شعیب ندوی صاحب نے قبول کی ہے، پہلے مرحلہ میں انہوں نے اردو کے صاحب طرز ادیب و انشا پرداز اور زبان کے رمز شناش مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا یہ مضمون منتخب کیا ہے، جو نذر قارئین ہے۔ (مدیر)۔

اگر آپ کا تعلق اونچے طبقہ سے ہے تو کسی ''سرا'' میں ٹھہرنا آپ کے لیے باعث توہین، لیکن کسی ''ہوٹل'' میں قیام کرنا ذرا بھی باعث شرم نہیں، حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ ''سرا'' مشرقی ہے، ہندوستانی ہے، دیسی ہے اور ''ہوٹل'' مغربی ہے، انگریزی ہے، ولائتی ہے۔ کوئی اگر یہ کہہ دے کہ ''سرا'' کے فلاں ''بھٹیارے'' سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں لیکن فلاں ہوٹل کے منیجر سے آپ کا بڑا ربط وضبط ہے اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ سرا کے ''بھٹیارے'' اور ہوٹل کے ''منیجر'' کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولائتی ہونے کے اور کوئی فرق ہے؟ کسی مدرسہ میں اگر آپ ''مدرس'' ہیں تو بات کچھ معمولی ہی ہے، لیکن کسی ''کالج'' میں آپ ''لکچرار'' یا ''پروفیسر'' ہیں تو معزز ہیں، صاحب وجاہت ہیں حالانکہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے ''مدرس'' اور ''پروفیسر'' ایک ہی چیز ہیں۔

ندوہ کے ''دارالاقامہ'' میں اگر آپ قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل کچھ خوش نہیں ہوتا لیکن اسی ''دارالاقامہ'' کا نام جب آپ ''شبلی ہوسٹل'' سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ فخر و خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ ''مدرسہ'' میں اگر آپ پڑھتے یا پڑھاتے ہیں تو خود اپنی نظروں میں آپ بے وقعت ہیں۔ لیکن اگر آپ کا تعلق کسی ''کالج'' سے ہے تو پھر آپ سے زیادہ معزز کون ہے؟ اب ہر مدرسہ طبیہ، طبیہ اسکول اور مدرسہ تکمیل الطب اور ''مدرسہ'' منبع الطب، اب تکمیل الطب کالج'' اور ''منبع الطب'' ''کالج'' ہیں۔ مدرسہ وہاجیہ طبیہ کا زمانہ گیا۔ اب اس کا صحیح نام ''طبیہ وہاجیہ کالج'' ہے، طبی درسگاہوں کو چھوڑئے، خود دینی درسگاہوں کا کیا حال ہے؟ وہ دن گئے جب

زبانوں پر ''مدرسہ چشمۂ رحمت'' کا تذکرہ تھا۔اب وہ ''چشمۂ رحمت کالج'' ہے اور وہاں کے صدر مدرس ''پرنسپل'' صاحب ہیں، مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل کے سب سے بڑے استاد کو ''صدر مدرس'' ذرا کہہ کے تو دیکھیے آپ کی غلطی کی تصحیح کی جائے گی کہ ان کا عہدہ اب صدر مدرسی کا نہیں ''پرنسپلی'' کا ہے۔

کوئی آپ سے کہے کہ یہ کیا آپ گلی میں کھڑے ہوکر ''گلی ڈنڈا'' کا تماشہ دیکھ رہے ہیں تو آپ شرما سے جائیں گے، لیکن جب آپ ''کرکٹ'' یا ''فٹ بال'' یا ہاکی میچ کھلے میدان میں دیکھ رہے ہوں گے تو اس وقت نہ آپ اپنے بڑوں سے شرمائیں گے نہ چھوٹوں سے، بلکہ عجب نہیں کہ گراں قدر ٹکٹ خریدنے کے بعد دوسروں کی طرف اکڑ کر دیکھیں۔ مینڈھے لڑاتے ہوئے یا بٹیر بازی یا مرغ بازی کرتے ہوئے اگر آپ کہیں پکڑ لیے گئے تو اپنے کو کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہ سمجھیں گے۔لیکن جب شہر میں باکسنگ کا مقابلہ ہوگا یا کوئی Heavy Weight Champion آجائیں گے تو ان کا تماشہ دیکھنا تہذیب وروشن خیالی میں داخل۔کہیں چوری چھپے ''رہس'' یا ''نوٹنکی'' دیکھنے کھڑے ہوجایئے تو خود آپ کی ثقافت اور وضعداری آپ پر لاحول پڑھنے کے لگے۔لیکن تھیٹر میں آدھی آدھی رات بے تکلف بسر کیجئے کہ ''ڈراما'' جیسے فن شریف کی شرافت وعظمت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ اپنے دیس کے کسی بھانڈ، کسی سازندہ، کسی ڈھاڑی سے، اگر آپ کی شناسائی ہوگئی ہے تو اس کا ذکر آپ اپنے دوستوں اور بے تکلف ہم عصروں کے سامنے بھی کچھ جھینپ ہی کر کرتے ہیں۔لیکن ''چارلی چپلن'' اور ''میری پکفرڈ'' کے کمالات اور ''آرٹ'' کی جتنی داد، جی چاہے دیجیے، بھری محفلوں میں، بزرگوں اور استادوں کے مجمع میں اور اخبارات کے صفحات میں آپ کی نقادی ہی کی داد ملتی جائے گی! ''نٹوں'' کا پیشہ بھی بھلا کوئی عزت کا پیشہ ہے اور خدا نخواستہ آپ کی کسی نٹ یا نٹنی سے ملاقات کیوں ہونے لگی، لیکن وہی قلابازیاں کھانے والے جب سرکس والے اور سرکس والیاں بن کر آپ کے سامنے آتے ہیں، تو نہ آپ ان سے ملنے میں شرماتے ہیں، نہ تعلقات بڑھانے میں۔

جوئے یا جواریوں سے ظاہر ہے ہماری شرافت کو کیا تعلق ہوسکتا ہے، کوئی ہمیں جواری کہہ دیکھے، اپنی جان اور اس کی جان ایک کردیں، لیکن گھوڑ دوڑ کے دنوں میں اور کارنیوال کی راتوں میں، دن دہاڑے اور بجلی کی روشنی میں یہی ذلت ہمارے لیے عین عزت بن جاتی ہے اور بڑے بڑے رئیس اور معزز نہ جوئے کی بازی لگاتے ہوئے شرماتے ہیں اور نہ اپنے کو ریس باز کہلاتے۔ نخاس میں کسی کباڑیئے کی دوکان پر مول تول کرنا ہماری عزت و شرافت کے لیے باعث ننگ، لیکن مال روڈ پر ''پیک ایلن'' کی کوٹھی میں گشت لگانے میں نہ کوئی عار ہے نہ کوئی شرم، اس لیے کہ ''پیک ایلن'' صاحب کوئی کباڑیے تھوڑا ہی ہیں ''آکشنز'' اور ''نیلامیے'' ہیں۔ چوک اور امین آباد میں کسی حلوائی کی دوکان سے پوری مٹھائی اپنے ہاتھ سے خریدیئے تو نظریں بچا بچا کر، لیکن حضرت گنج میں ویلریو کی دوکان کے سامنے اپنا موٹر کھڑا کر کے کیک و پیسٹری کی خریداری بہ نفس نفیس، بلا جھجک فرمایئے، اس لیے کہ ''ویلیر یو'' حلوائی نہیں، ''کنفکشنر'' ہے، نظیر آباد کے کسی چوراہے پر کسی شربت والے کی دوکان سے فالودہ کا گلاس خریدنا آپ کی خودداری کے منافی، لیکن حضرت گنج میں صاحب کی جگمگاتی دوکان پر آئس کریم نوش فرمانا آپ کی عزت اور شان کے عین مطابق، کسی نانبائی کی دوکان کا نام اگر ''ریسٹران'' پڑ جائے تو وہی عار فخر میں تبدیل ہوجائے۔ ''نائی'' بیچارہ جب تک محض نائی ہے یا حجام، اس کے استرے اور کسوت کے آگے سر جھکانا آپ کیوں کر گوارا فرما سکتے ہیں۔ لیکن وہی جب اپنے کو ہیئر ڈریسر Hair

Dresser کہلانے لگے اور اپنے چوراہے کی دوکان پر ''ہیئر کٹنگ سیلون'' کا سائن بورڈ لگا دے تو وہی ناگوار آپ کے لیے خوشگوار و پسندیدہ بن جائے۔ عدالت کا پیادہ جب تک ''چپراسی'' یا مذکوری'' ہے حقیر و ذلیل ہے لیکن وہی پیادہ اگر ''بیلف'' کہہ کر پکارا جائے تو معزز ہے اور آپ کی زبان پر محض بیلف نہیں بلکہ ''بیلف صاحب'' آنے لگے، کوئی چمار یا موچی اس قابل کب ہوتا ہے کہ آپ اسے منھ لگائیں، لیکن وہی رذیل اگر کسی ٹینری کا مالک کہلانے لگے تو معاً اس کی رذالت آپ کی نگاہ میں عزت و شرافت سے بدل جاتی ہے، اور دنیا کے سب سے بڑے موچی باٹا کی قوم سے تعلق رکھنا تو عین دلیل اعزاز، بستی کا ساہوکار یا مہاجن بڑے سے بڑا ہو آپ کی نظر میں محض ''بنیا'' ہے لیکن وہی بنیا اگر وہیں کسی بینک کا منیجر ہو جائے یا اپنے کو بینکر کہلانے لگے تو دیکھیے اس کا مرتبہ دم بھر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے، کسی رئیس کا ''مصاحب'' آپ کی نظر میں اخلاقی حیثیت سے بے عملی، خوشامد، چاپلوسی اور خود فروشی کا مجسمہ ہے۔ لیکن صاحب کے ''پرائیوٹ سکریٹری'' اور ''اے، ڈی، سی'' کا نام ادھر آیا اور ادھر معاً آپ کی نظروں میں کارکردگی و مستعدی، رعب و دبدبہ کی تصویر پھر گئی،! پنچایت کا نام آیا اور آپ کے ذہن نے نیچ قوموں کا تصور شروع کر دیا، لیکن ادھر پنچایت کے بجائے پارلیمنٹ اور اسمبلی، کونسل اور کارپوریشن کے الفاظ بولے گئے اور آپ کا ذہن ان فرنگی پنچایتوں کی بلندیوں پر رشک کرنے لگا، کوئی مولوی غریب اگر عالمگیری اور شامی کے جزئیات فقہی کا حافظ ہے تو غبی ہے، کودن ہے، کندہ ناتراش ہے، محض ملّا ٹا ہے۔ لیکن اگر کسی ایڈوکیٹ یا بیرسٹر صاحب کو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے نظائر ازبر ہیں۔ تو ان کی قابلیت خوش دماغی اور ذہانت کے اعتراف میں سب سے آگے آپ ہی ہیں۔

فسانہ عجائب اور طلسم ہوشربا کے نام آج مجال ہے کہ کوئی زبان پر لا سکے لیکن لندن اور برلن، پیرس اور نیویارک سے کتنے ہی نئے نئے عجائب افسانے اور کتنے ہی ہوشربا طلسمات رومانی ناولوں کے نام سے جاسوسی افسانوں کے نام سے ''سنسنی خیز'' خبروں کے نام سے، صاعقہ اثر ڈراموں کے نام سے اور خدا معلوم کن کن ناموں سے ہر سال اور ہر ہفتہ، اور ہر روز اور ہر صبح اور ہر شام شائع ہوا کریں۔ ان سے باخبر رہنا اور پوری دلچسپی و انہماک کے ساتھ ان کے نشر و اشاعت میں، ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہنا علم و روشن خیالی کی دلیل اور مہذب و تعلیم یافتہ ہونے کی سند! کوئی آپ کو صلاح دے کہ ''لوہاری'' کا پیشہ اختیار کیجیے، تو آپ اسے گالی سے کچھ ہی کم سمجھیں لیکن ''میکینکل انجینری'' کے عہدہ کی طرف آپ خود لپک لپک کر بڑھ رہے ہیں۔ ''جراح'' کے لفظ سے جو تخیل آپ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ کس درجہ پست ہے، لیکن ''سرجن'' کا نام لینے سے اس پستی میں کتنی بلندی آجاتی ہے، محلّہ اور پڑوس کے ''جلاہے'' آپ کے خیال میں پست و ادنیٰ، لیکن کپڑا بننے والے اگر لنکا شائر کے ہیں، تو کیا ان کی بابت بھی آپ کا یہی خیال ہے؟ ''بزاز'' گز ہاتھ میں لیے اور مزدور کے سر پر گٹھری اٹھائے شہر میں پھیری کرتے پھرتے ہیں۔ ان کی کوئی عزت و وقعت نگاہ میں نہیں، لیکن وہی کپڑا بیچنے والے اگر مانچسٹر کے باشندے ہیں تو بس معزز ہیں، بلند ہیں، ''بزرگوں'' کے سالانہ فاتحے منانا دلیل حمق و علامت وہم پرستی، لیکن فلاں کالج کے احاطے میں ''فاؤنڈرس ڈے'' یا ''یوم تاسیس'' دھوم دھام سے منانا، دلیلِ دانش و برہانِ روشن خیالی۔ لکھنؤ کے چوک یا دہلی کی چاؤڑی کی پیشہ ور کا نام آپ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ ہرگز اپنے کسی بزرگ کے سامنے نہ لیں گے۔ نہ کسی کا ناچ مجرا دیکھنے کھلم کھلا تشریف لے جائیں گے لیکن ڈرائنگ روم میں گھر کے سب مردوں اور عورتوں لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے ریڈیو سے، بے تکلف آپ فلاں بائی

جی اور فلاں ''جان'' کے نغموں، ٹھمریوں سے لطف اٹھائیں گے اور فلم ایکٹرس جو بھی آپ کے دل میں جگہ کرلے گی، پوری بیبا کی سے آپ اس کے چرچے ہر چھوٹے بڑے کے سامنے کریں گے۔

کوئی کہاں تک گنائے اور ناموں اور لفظوں کی کتنی لمبی فہرست تیار کرے۔ نمونہ کے لئے یہ کافی بلکہ کافی سے کچھ زائد ہی ہیں۔ اپنی واقفیت کی دنیا میں خود نظر دوڑائیے اور دیکھ لیجیے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، معاشرت و معاملت کے ہر گوشہ میں فرنگیت کا کتنا رعب ہم پر، اور آپ پر چھایا ہے۔ حقیقت ایک معنی و مفہوم متحد، لیکن جو لفظ اور جو نام، فرنگیت کے راستہ سے ''صاحب'' کے رشتہ سے، آپ کے کانوں تک پہنچے ہیں ان میں ان کے دیسی مترادفات سے کتنی زیادہ عظمت، کتنی زیادہ اہمیت، کتنی زیادہ بلندی ہمارے دلوں اور دماغوں نے غیر محسوس طور پر قبول کرلی ہے! اگلوں نے بہت کیا تو یہی کیا تھا کہ ملک فتح کر لیے، قلعے سر کر ڈالے، فوجوں کو میدان جنگ میں شکست دے دی۔ اس سے زیادہ چنگیز سے کچھ بن پڑا نہ ہلاکو سے، نہ دارا سے نہ سکندر سے، یہ شرف مخصوص اسی دور یا جوجی کے لیے اٹھ رہا تھا کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و دماغ بھی فتح کر لیے جاتے ہیں اور ہاتھوں پیروں کے علاوہ عقلوں دماغوں اور بصیرتوں سے بھی خط غلامی لکھا لیا جاتا ہے، یہاں تک کہ غیر محکوموں کے پاس، خیر و شر حسن و قبح، ہنر و عیب کا معیار لے دے کے بس یہی ایک رہ جاتا ہے کہ ''صاحب'' کی چشم التفات کدھر ہے؟ عزت بھی ''صاحب'' کی دی ہوئی، اور دولت بھی سرکار کی مرحمت کی ہوئی۔ دین بھی وہیں کا عطیہ، اور دنیا بھی انہیں کی بخشش، اب نہ ہندو ہندو ہے، نہ مسلمان، مسلمان۔ سب ''رعایائے سرکار'' اب نہ کوئی اللہ دین ہے نہ رام دین بلکہ سب کے سب چھٹ چھٹا کر ''صاحب دین''۔

الفاظ عمومی کو چھوڑیئے۔ ستم یہ ہے کہ اعلام اور اسماء معرفہ تک یورپ زدگی کی وبا سے محفوظ نہیں۔ میاں ''کلو'' کو آپ نے اپنے ہاں جب دیکھا اسّہ بانی ہی کرتے پایا۔ لیکن میجر بلیک (Black) آپ کے شہر کے سول سرجن ہیں! ''کلوا مہتر'' آپ کے محلّہ ہی میں رہتا ہے، لیکن پروفیسر ''بلیکی'' (Blackee) یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر ہیں! ''لالہ گھاسی رام'' بیچارے ''کانجی ہاؤس'' کی محرری سے عمر بھر آگے نہ بڑھ سکے، لیکن بریگیڈیر جنرل ''ہے'' (Hay) برطانوی فوج کے ایک مشہور و معروف افسر ہیں! 'میاں رمضانی'' اور میاں شبراتی کی ساری عمر خدمت گاری میں گذری لیکن مسٹر ''مے'' (May) اور ڈاکٹر فرائڈے (Friday) پارلیمنٹ کے نامور ممبر ہیں! ''مٹھوا'' کہار اور ''طوطا'' کلوار آپ کی بستی ہی میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں لیکن سر ''جان پارٹرج'' (Partridge) آپ کے صوبہ کے گورنر تھے۔ مسٹر ''کاک'' (Cock) اس وقت آپ کے ضلع کے کلکٹر ہیں اور ''سوان'' (Swan) صاحب ابھی تبدیل ہوکر کمشنری پر گئے ہیں! آپ کے ماما کا لڑکا ''شیرا'' بیچارہ اب تک چپراسی کی جگہ امیدواری کر رہا ہے لیکن ''بل'' صاحب (Bull) ترقی پاکر کمشنر ہوگئے اور مسٹر لیمب (Lamb) اور مسٹر ''کڈ'' (Kid) آپ ہی کے ضلع میں حاکم بندوبست اور جائنٹ مجسٹریٹ ہیں۔ ''دریاؤ سنگھ'' غریب کو لائن جمعداری سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا۔ سرجان لیک (Lack) دیکھتے دیکھتے ای، آئی، آر کے ایجنٹ ہوگئے! ''لالہ لوہاری مل'' کے چلائے عرائض نویسی کا کام بھی نہ چلا، جسٹس اسمتھ (Smith) ہائی کورٹ کی ججی پر پہنچ گئے! ''شیخ جھاؤ'' کی زندگی نور بانی کرتے کرتے ختم ہوگئی۔ سرچارلس ''ووڈ'' (Wood) حکومت ہند کے ہوم ممبر ہیں! جنگلی گھسیارہ بیچارہ عمر بھر گھاس ہی چھیلا کیا، سرجان فارسٹر (Forester) سنا ہے کہ امریکہ میں برطانیہ کے کونسل جنرل ہوگئے۔

☆☆☆

آخری صفحہ

"میں خود کو اسکا اہل نہیں سمجھتا"

(م۔ق۔ن)

ہشام بن عبدالملک کے زمانہ خلافت میں ابراہیم بن عیلہ نام کے ایک بزرگ تھے جن کی دیانت وامانت زہدوتقوی اور خشیت و للّٰہیت کی بڑی شہرت تھی، اور لوگوں میں ان کی نیکی اور بزرگی کا بڑا چرچا تھا۔ ہشام بن عبدالملک نے ان کو مصر کا گورنر بنانا چاہا مگر انہوں نے اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور معذرت کر لی، اور اسکی وجہ یہ بتائی کہ میں خود کو اسکا اہل نہیں سمجھتا، ہشام بن عبدالملک کو ابراھیم بن عیلہ کا یہ جواب انتہائی ناگوار گزرا، اس نے غصہ سے کہا کہ تمہیں اس عہدہ کو قبول کرنا ہوگا، ابراہیم بن عیلہ وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس وقت تو خاموش ہوگئے، لیکن کچھ عرصہ بعد جب ہشام بن عبدالملک نے پھر اصرار کیا تو جواب میں انہوں نے کہا کہ اللہ تعالی نے اپنے پاک کلام میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے اپنی امانت کو زمین وآسمان کے سپرد کرنا چاہا مگر انہوں نے انکار کردیا، جب اس انکار پر اللہ تعالی ان سے ناخوش نہیں ہوا تو آپ مجھ سے کیوں ناراض ہوتے ہیں؟ خلیفہ نے یہ جواب سن کر ان کی جگہ کسی اور کو متعین کردیا۔

اسلامی تاریخ کے روشن اور زریں صفحات میں اس طرح کے ہزاروں واقعات محفوظ ہیں کہ ہمارے اسلاف دیانت وامانت زہدو تقوی اور خوف خدا کی دولت سے مالا مال تھے اور نیکی و پرہیزگاری کے اعلی مقام پر فائز تھے، اور آخرت کی باز پرس کے ڈر سے بڑے سے بڑے عہدوں کو ٹھوکر مار دیتے تھے، اگر انہیں یہ محسوس ہوجاتا تھا کہ حکمران وقت انکی خدمت میں عہدہ ومنصب پیش کریں گے تو وہ پہاڑوں اور غاروں میں چھپ جایا کرتے تھے۔لیکن آج کے زمانہ میں معیار بدل چکا ہے، لوگ عہدہ ومنصب کے لئے جان تک دے دیتے ہیں۔میڈیا کا سہارا لیتے ہیں، اپنے کو مستحق اور حقدار ثابت کرنے کے لئے عدالتوں کا بھی سہارا لیتے ہیں، عوام تو عوام طبقۂ خواص بھی عہدہ ومنصب کے حصول کے لئے سیاست و مذہب کے نئے نئے روپ دھارتا ہے اور ہر راہ سے اپنا یہ مقصد حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے، ہوسِ زر اور ہوسِ اقتدار دونوں انسانیت اور دین کے لئے زہر ہیں، اس لئے حضور نے اسکی تمثیل اس طرح بیان فرمائی ہے:

''دوخونخوار بھیڑیوں کا کسی زخم کو چاٹ چاٹ کر خراب کرنا زخم کے لئے اتنا مضر نہیں جتنا مضر ایک مسلمان کے دین لئے حب جاہ اور حب مال ہے۔'' (مسلم)

اس تمثیل نبوی سے طلب عہدہ ومنصب اور ہوسِ اقتدار کی زہر ناکی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے اسلاف عہدہ و منصب کے حصول سے ڈرتے تھے اور ہوس اقتدار کے فتنہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتے تھے، ہمارے اکابرین تو اختلاف کی صورت میں عہدہ تک چھوڑ دیا کرتے تھے، چنانچہ آزادی سے پہلے کانگریس اور مسلم لیگ کے جھگڑوں کے دوران جب ذمہ داران دارالعلوم نے حکیم الامت حضرت تھانوی کی بات نہیں سنی اور اندیشہ اختلاف کا ہوا تو آپ نے دارالعلوم کی سرپرستی سے فوراً استعفا بھجوادیا، اور آپ اسکے لئے بھی آمادہ تھے کہ اگر مخالفین خانقاہ اور مدرسہ (واقع تھانہ بھون) خالی کرنے کے لئے کہیں گے تو میں خالی کردونگا۔اس لئے خواص امت کو چاہیے کہ وہ عہدہ ومنصب کے حصول میں اختلاف سے مکمل اجتناب کریں کیوں کہ یہ دور ذرائع ابلاغ کا ہے، قدم قدم پر کیمرے کی آنکھیں، یا اخبار نویسوں کی متجسس نگاہیں آپ کو دیکھ رہی ہیں، ذرا سا کوئی پتہ ادھر کھڑکتا نہیں ادھر ان کو خبر ہوجاتی ہے پھر آپ کے جھگڑوں کی خبریں عوام کو ضیافت طبع کے لئے پیش کردی جاتی ہیں جس سے علماء کا وقار کم ہوتا ہے، پھر لوگ مولویوں کو عہدوں کا حریص، اقتدار پرست، دولت کا غلام اور نہ جانے کیسے کیسے القاب سے نوازتے ہیں۔

اللہ ہم سب کو ان حقائق کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق دے (آمین)

☆☆☆

زندہ نبی

یوں آنے کو تو سب ہی آئے، سب میں آئے، سب جگہ آئے (سلام ہو ان پر) بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے، لیکن کیا کیجئے کہ ان میں جو بھی آیا جانے ہی کے لئے آیا، پر ایک اور صرف ایک جو آیا اور آنے ہی کے لئے آیا، وہی جو اگنے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور چمکتا چلا جا رہا ہے، بڑھا اور بڑھتا چلا جا رہا ہے، چڑھا اور چڑھتا چلا جا رہا ہے، سب جانتے ہیں اور سبھوں کو جاننا ہی چاہیے کہ جنہیں کتاب دی گئی اور جو نبوت کے ساتھ کھڑے کئے گئے، برگزیدوں کے اس پاک گروہ میں اس کا استحقاق صرف اسی کو ہے اور اس کے سوا کس کو ہو سکتا ہے جو پچھلوں میں بھی اسی طرح ہے جس طرح پہلوں میں تھا، دور والے بھی اس کو ٹھیک اسی طرح پا رہے ہیں اور ہمیشہ پاتے رہیں گے جس طرح نزدیک والوں نے پایا تھا، جو آج بھی اس طرح پہچانا جاتا ہے اور ہمیشہ پہچانا جائے گا جس طرح کل پہچانا گیا تھا کہ اسی کے اور صرف اسی کے دن کے لئے رات نہیں، ایک اسی کا چراغ ہے جس کی روشنی بے داغ ہے۔

(مولانا مناظر احسن گیلانیؒ)

جامعۃ البنات حیدرآباد

JAMIATUL BANATH HYDERABAD

شعبہ حفظ عالمیت، فضیلت

لڑکیوں کا اعلیٰ و معیاری دینی ۲۸ سالہ قدیم جامعہ

شہر کے اہم مقامات سے بسوں کی سہولت

دینی تعلیم کے علاوہ انگریزی و کمپوٹر بھی سکھایا جاتا ہے۔ جس کے لئے خاص کمپیوٹر لیب پوری ضرورتوں سے آراستہ ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی (اوریئنٹل لینگویجس) کے ذریعہ میٹرک، انٹر، بی اے کے امتحانات بھی دلوائے جاتے ہیں۔

ایک سالہ اسلامک ڈپلومہ (کالج کی طالبات کے لئے) شعبۂ تربیت۔ دبلوم العالی فی علوم الشرعیہ۔

(فارغات دینی مدارس کے لئے ایک نادر موقع)

والدین سے گزارش ہے کہ اپنی لڑکیوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے لئے اس جامعہ میں داخلہ دلوائیں۔

نوٹ: (۱) اضلاع کے طالبات کے لئے جامعہ میں معیاری ہاسٹل کی سہولت ہے۔ (۲) شہر میں اس جامعہ کی اور کوئی شاخ نہیں ہے۔

JAMIATUL BANATH HYDERABAD
Ac/No. 05110011021119. (Andhra Bank)
Ac/No. 19380100018623 (Bank of Baroda)

صاحب خیر حضرات جو جامعہ کا تعاون کرنا چاہتے ہیں ہمارے بینک اکاونٹ نمبرس:

پتہ: جیون یار جنگ کالونی، روبرو مدینہ میڈیکل ہال، VIP اسکول کی گلی، سعید آباد، حیدرآباد۔

رابطہ نمبر: 7032101979,9848431304,(040)24553534

Website:www.jamiatulbanath.org